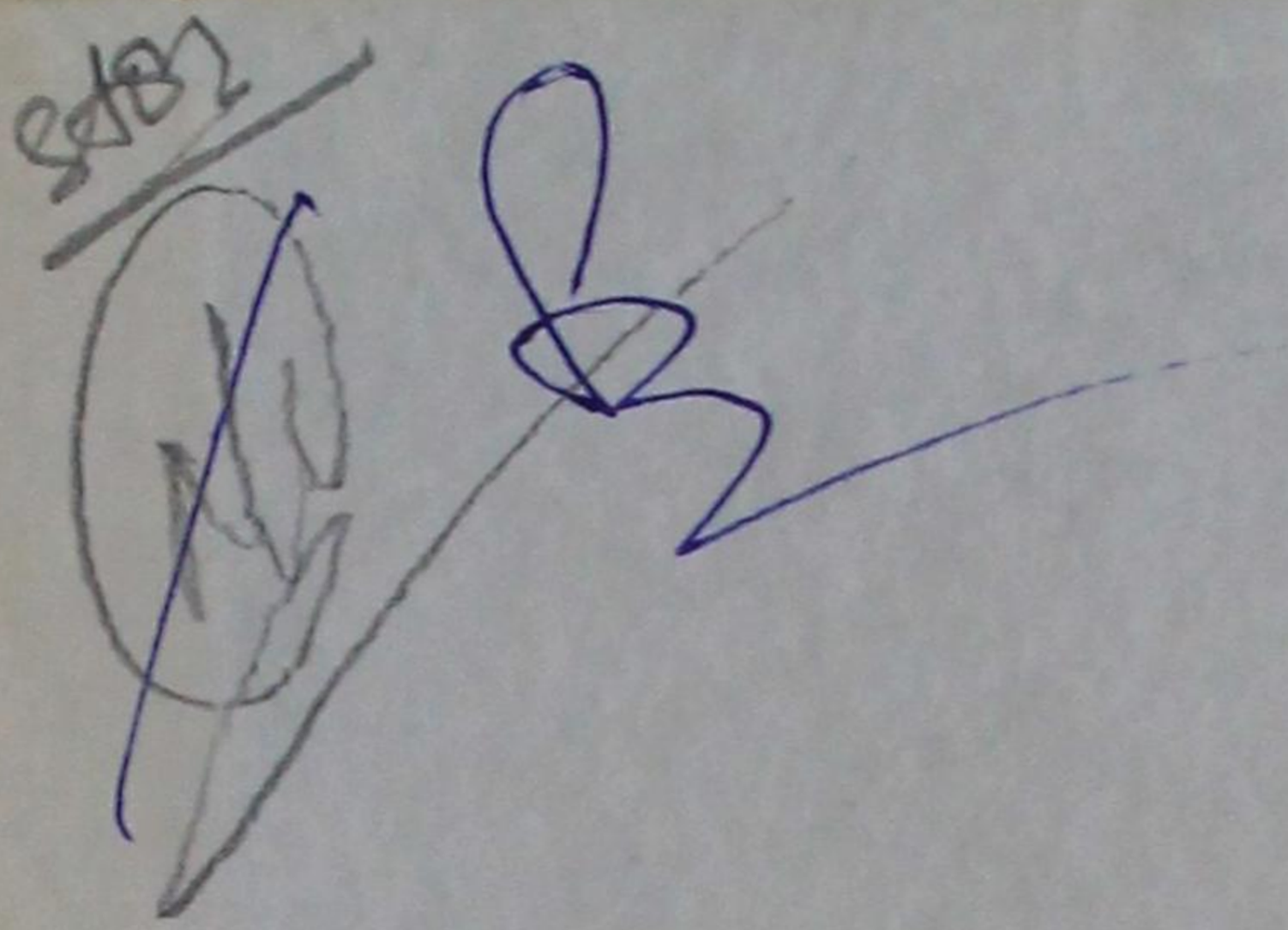

6/12/75

دیوانِ بقا

ذخیرۂ اشپرنگر

مع مقدمہ

از

پروفیسر خواجہ احمد فاروقی

صدرِ شعبۂ اُردو دہلی یونی ورسٹی

سلسلۂ اشاعتِ مخطوطاتِ اُردو

دیوانِ بقا

شائع کردۂ شعبۂ اُردو دہلی یونی ورسٹی

قیمت ساڑھے تین روپے

(یونین پرنٹنگ پریس دہلی)

ب 229 د
ALLAMA IQBAL LIBRARY
98494
CHECKED
ST 01
K UNIVERSITY LIB.
Acc No 98494
Date 12-2-73

فہرست عنوانات دیوانِ بقا

مقدمہ پروفیسر خواجہ احمد فاروقی	۱
غزلیات	۱
رباعیات و قطعات	۵۵
قصائد	۶۱
ہجویات	۷۶
فارسی کلام	۸۵

مقدمہ

میر کی ہجو میں بقا کے یہ دو شعر بہت مشہور ہیں :

میر نے تو ترا مضمون دو آبے کا لیا — پر بقا تو یہ دعا کر جو دعا دینی ہو
یا خدا میر کے دیدوں کو دو آبہ کر دے — اور بینی یہ بہا اُس کی کہ تر بینی ہو[1]

بقا صرف میر ہی کے حریف نہیں، سودا کے بھی تھے۔ اُن کے اِن معرکوں کی آبِ حیات کے علاوہ تقریباً تمام تذکروں میں درج ہے۔

گارساں دتاسی نے لکھا ہے :

" محمد بقاء اللہ تخلص بقا، حافظ لطف اللہ کے بیٹے تھے۔ ان کی ولادت اکبر آباد (آگرہ) میں ہوئی لیکن نوجوانی میں لکھنؤ آکر رہنے لگے تھے۔ ان کا خط بہت پاکیزہ تھا۔ مشرق کے لوگوں میں اس فن کی مہارت بہت پسند کی جاتی ہے۔ اشعار بھی اچھے کہتے تھے، دہلی میں وہ ابتداءً غمیں تخلص کرتے تھے۔ بعد میں شاہ حاتم کے کہنے پر بقا اختیار کیا۔ وہ حاتم، میر درد اور خصوصیت کے ساتھ میر فاخر مکین کے شاگرد تھے۔ مصحفی سے ان کے گہرے مراسم تھے جن کے پاس وہ دہلی میں اکثر جایا کرتے تھے۔ مصحفی کا بیان ہے کہ وہ خلیق، ظریف اور قانع جوان تھے جیسا کہ مذہبی لوگ ہوتے ہیں۔ ان کی طبعِ شوخ ہجو کی طرف مائل تھی۔ اسی وجہ سے دہلی میں ان کے

---

[1] دیوانِ بقا قلمی ورق ۴۰ ب۔ ذخیرۂ اشپرنگر۔ نسخہ مطبوعۂ دہلی یونی ورسٹی ص ۸۷

میر سے اور لکھنؤ میں سودا سے معرکے ہوئے۔ لطف کا بیان ہے کہ بقا کا انتقال کربلائے معلّیٰ اور نجفِ اشرف کی زیارت کے دوران میں ہوا۔ یہ سفر انھوں نے ۱۲۰۶ ھ (مطابق ۱۷۹۱ء) میں کیا تھا۔ انھوں نے ایک دیوان چھوڑا ہے جو ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں ہے۔

فاخر مکین جن کا ذکر اوپر آیا ہے، غرور کی وجہ سے اپنے آپ کو شمالی ہندوستان کے معروف شاعر علی حزیں سے بہتر سمجھتے تھے۔ موخر الذکر مسلمانوں میں اپنے زہد کی وجہ سے مشہور ہیں۔ ان کی خود نوشت سوانح کا ترجمہ مسٹر بلفور نے کیا ہے۔ فاخر نے حزیں کے اشعار میں اصلاح دینے کی جسارت کی۔ اس پر سودا نے جو ہندوستان کے JUVENAL ہیں ان کی ہجو لکھی[1]۔"

سعادت خاں ناصر صاحبِ تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا نے بقا پر سودا کی اہانت کا الزام لگایا ہے:

شیخ بقاء اللہ تخلص بقا پسرِ حافظ لطف اللہ خوش نویس اکبر آبادی۔ بیشتر عمیں تخلص قرار دیا تھا۔ جب شاگرد شاہ حاتم کا ہوا، بقا تخلص کیا۔ حاتم کے شاگرد تمام رفیع سودا سے رجوع لائے مگر بقا کہ نام حاتم کا اوسے بقا رہا منکرِ سودا غائب و حاضر بلکہ اہانت سودا کی اوس کے کلام سے ظاہر اور میر تقی میر سے بھی ناصاف، غلطی کا اوس کی اعتراف، ہر دو بزرگوار کی مذمت سے آلودہ اور خامہ صفحۂ ہجو پر فرسودہ رکھتا تھا۔ آخر عمر میں وحشت نے اوس کی طبع پر راہ پائی، دیوان کو اپنے اوسکی مکافات میں کہ بہت سے پردۂ ناموس پارہ کیے تھے کاغذِ مشکوک کی طرح پارہ کیا۔ چند شعر اوس کے کہ احباب کی بیاضوں میں رقم تھے جمع ہوے۔

---

[1] گارساں دتاسی: تاریخ ادبیات ہندی و ہندوستانی (فرانسیسی) جلدِ دوم طبعِ ثانی صفحات ۹۷ و ۹۸۔

حکایت : بعد کم ہونے اوس وحشت کے عازم بیت اللہ کا ہوا، اسباب خانہ مع
زمین چار سو روپیہ کو بیچا اور اس کا غلہ خرید کر کے کشتی میں بھر لیا۔[1]
مفتی صدر الدین آزردہ نے اپنے تذکرے میں بقا کا ذکر کیا ہے[2] لیکن اس
کوئی خاص بات نہیں۔ احد علی یکتا نے دستور الفصاحت میں اُن کی شان میں
قصیدہ خوانی کی ہے اور لکھا ہے کہ انھوں نے ریختہ کو فارسی کا اوج بخشا :

"ششم از طبقۂ ثانی، تہمتن میدان سخنوری، اسفندیار معرکۂ شاعری، بقاءاللہ خاں
بقا است، کہ بقوت صفائی و فصاحت الفاظ، حضیض ریختہ را باوج فارسی
رسانده، و بتوانائی بلاغت و متانت کلام، ادہم ہندی را باشہب عربی دوانده۔
شاعر قصیدہ گو گذشتہ، لہذا بمقابلہ مرزا محمد رفیع، در قصاید جوابش داد معنی یابی و
تشابیہ غریبہ داده۔ از متاخرین کسی ہمتر از وے او نبود۔ آخر آخر دماغش مختل گردیدہ
دیوانِ خود را مع ہمہ مسودہاے کلام خود، پارہ نمودہ (۲۰۸ الف) بآب تر کردہ،
در سبوچۂ کلان میداشت ہر کسے کہ طالب شعرش می آمد، ہماں سبوچہ نشاں دادہ
میگفت کہ " دریں ہمہ کلیات من است۔ ہر چہ منظور باشد، بنویسید۔ اما ہجوہاے
بعض کساں کہ کردہ ام برائے خدا ننویسید کہ من توبہ کردہ ام " وچوں آخر شوق زیارت
حضرت اباعبداللہ الحسین علیہ السلام دامنگیر شد، واز فرط غیرت، کہ مخمر طینتش بودہ،
نمی خواست کہ دست سوال پیش کس دراز کند یا اعانت زاد راہ جوید، ارادہ نمودہ کہ
دوسہ حرفہ خود بیاموزد؛ تا دراں بقعہ مبارکہ روزی حلال بکسب دست حاصل نمودہ
خوردہ باشد۔ چنانچہ کندن عقیق و نوشتن خط نستعلیق و نسخ و علم طب درہماں

---

[1] سعادت خاں ناصر : خوش معرکۂ زیبا قلمی۔ مخزونہ لکھنؤ یونی ورسٹی لائبریری ورق ۳۱ ب
[2] تذکرۂ صدر الدین آزردہ قلمی ص ۷، کیمبرج۔ عکس مملوکۂ راقم

مائل افتادہ در شاہجہاں آباد با میرؔ و در لکھنؤ با مرزاؔ معرکہ گیریہا کردہ و دقّت طبع خود را ظاہر نمودہ۔ حالا در لکھنؤ بکنجِ قناعت پا شکستہ اوقات بسری می کند۔ با فقیر گاہ گاہے ملاقات می شود۔[1]"

بقاؔ کے تعلقات میر حسنؔ سے بھی تھے۔ ان کے ساتھ بھی صحبتیں گرم رہتی تھیں اور وہ بھی اُن کے "خوش فکر و خوش اندیشہ" ہونے کے مقر تھے۔ تذکرۂ شعرائے اُردو میں لکھتے ہیں:

"بقا۔ غنچۂ بوستانِ وفا، سروِ موزونِ باغِ صفا، شیخ بقاء اللہ خاں المتخلص بہ بقا ابنِ حافظ لطف اللہ کہ در لکھنؤ مشہور اند۔ جوانے ست بہ کمالِ خوبی خوش فکر و خوش اندیشہ، در شعرِ فارسی از شاگردانِ میرزا فاخر مکیںؔ سلّمہ اللہ تعالیٰ لیکن شوقِ ریختہ نیز دارد۔ با فقیر صحبت ہا گرم داشتہ است خدا سلامت دارد۔[2]"

میر قدرت اللہ قاسمؔ نے بقاؔ کی گرم گفتاری، شوخ طبعی اور ظریف نہادی کا ذکر کیا ہے۔ مجموعۂ نغز میں لکھتے ہیں:

"بقا تخلص، محمد بقاء اللہ فرزند ارجمند حافظ لطف اللہ خوش نویس اکبر آبادی است۔ شعر فارسی بہ اصلاح مرزا محمد فاخر مکین رسانیدہ و اشعار ریختہ از نظر استاد اکثرے از سخن سنجانِ عالم شیخ ظہور الدین حاتمؔ گزرانیدہ بہر دو زبان اگرچہ گرم گفتار است امّا میلش بریختہ گوئی بسیار است۔ رخش شوخ طبعی و ظریف نہادی می پوید بہجو ہر کس بے محابا (کذا) مبادرۃ می جوید با سر آمد شعرائے فصاحت آما مرزا محمد رفیع سودا و سخن سنجِ بے نظیر محمد تقی میر طرف شدہ [تخطیہ نمودہ] بہجو ایشاں پرداختہ سزائے کردار ناہنجار [ایں] عزیزان

---

[1] غلام ہمدانی مصحفی: تذکرۂ ہندی طبعِ دہلی سنہ ۱۹۳۲ء ص ۴۳

[2] میر حسن: تذکرۂ شعرائے اردو طبع سنہ ۱۹۴۰ء ص ۳۲

بواجبی در [کنار] نہادہ زبان زدِ خاص و عام ساختہ کہ مرزا ہجو ہر کس بے ہیچ خیلے دلیر بودہ واز دستِ میر با ایں ہمہ قابلیت عنان جوہر [قابل ثنا] سی [کبرد] خود سریش در ربودہ۔ قصہ مختصر محمد بقاء اللہ اگرچہ گرد مضامین قدما میگردد۔ اما بغایت درست فکر، خوشگو، شیریں گفتار، معانی جو است۔[1]

قاسم کی طرح سرور نے بھی بقا کے کلام کی تعریف کی ہے۔ عمدۂ منتخبہ میں لکھتے ہیں:

"بقا تخلص۔ محمد بقاء اللہ[2]، خلف حافظ لطف اللہ خوش نویس، شاگرد میرزا محمد فاخر مکین، اصلش از اکبر آباد۔ شعر فارسی و ریختہ ہر دو می گوید۔ لیکن میلان طبعش بہ طرف اشعار ہندی بیش تر است۔ شوخ طبع و ظریف مزاج و بہ ہجو گوئی راغب۔ اکثر با میر و مرزا معارض شدہ و در اشعارِ ایں ہر دو برگزیدہ شعرائے ہندوستان سقم برآوردہ و ہجوہا گفتہ۔ پختگی کلامش و عذوبت گفتارش از تصانیفش ہویدا است۔ از شیریں کلامی اوست[3]"

شاہ کمال نے مجمع الانتخاب[4] میں اور لطف نے گلشن ہند میں بقا کا نام محمد بقا لکھا ہے۔

کریم الدین[5] نے لطف کے حوالے سے لکھا ہے کہ وہ ۱۲۰۶ھ میں حج کے ارادے

---

[1] قاسم: مجموعۂ نغز جلدِ اول۔ طبعِ لاہور ص ۱۰۷

[2] خوب چند ذکا نے محمد بقاء اللہ خاں نام لکھا ہے۔ (عیار الشعرا قلمی ورق ۳۱ الف)

[3] میر محمد خاں سرور: عمدۂ منتخبہ شایع کردۂ شعبۂ اردو دہلی یونی ورسٹی ص ۱۲۷

[4] شاہ محمد کمال: مجمع الانتخاب قلمی ورق ۱۰۰ ب

سے حجاز کی طرف گئے تھے۔ یہ قول صحیح نقل نہیں ہوا۔ لطف کا بیان یہ ہے ؛

"بقاؔ تخلص، محمد بقا نام، بیٹا حافظ لطف اللہ کا شاگردوں میں سے میرزا فاخر مکینؔ تخلص کے تھا۔ فی الحقیقت عزیز نکتہ سنج و باریک بین و معنی بند و سخن آفریں تھا۔ میرزا رفیع سوداؔ تخلص کے منہ اکثر چڑھا اور اس نہنگ بحر معانی کی ہجو میں کچھ کچھ واہیات مکرر بکا، لیکن میرزاے مرحوم نے مطلق اعتنا نہ کی اور یہ بات کہی کہ میں نے جس کی ہجو کی، نام اس کا اسی تقریب سے تمام عالم میں ہوا مشہور ہے۔ سو تیری ہجو نہ کروں گا کہ تیرا مشہور کرنا مجھے نہیں منظور ہے۔ غرض اس عزیز سے زمانے نے موافقت کبھی نہ کی اور صورت روزگار کی بیچارے نے آئینے میں خیال کے بھی نہ دیکھی۔ افلاس سے تنگ آکر کسی کے کہے سے کچھ اعمال تسخیر کواکب کے شروع کیے تھے۔ خیال میں اس سودائے خام کے مجنوں ہوئے اور جب تک جیے سودائی رہے۔ سنہ ۱۲۰۶ھ بارہ سو چھ ہجری تھی کہ حالت میں سودائی کے یہ بات سوجھی کہ تحصیل دولت عقبیٰ کیجیے اور خاکِ راہ سے کربلاء معلّا اور نجف اشرف کی دیدۂ دل میں سرمۂ حق نما دیجیے۔ یہ عزم کرکے جہاز پر سوار ہوئے اور منزل مقصود کی طرف قدم گزار ہوئے۔ اثناے راہ میں اس دارِ فانی سے، موافق نام اپنے کے، سفر ملک بقا کا کیا۔"[1]

کریم الدین نے بقاؔ کا شمار طبقۂ دوم کے شعرا میں کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ حاتمؔ، دردؔ اور مکینؔ کے شاگرد تھے:

"اول اوس نے تخلص غمیں رکھا بعد ازاں دہلی میں آکر بقاؔ تخلص اختیار کیا۔ یہ تخلص بہ سبب فرمانے شاہ حاتمؔ کے جو کہ اوس کا استاد تھا بدلا تھا۔ خواجہ میر دردؔ

---

[1] لطف: گلشنِ ہند طبع ۱۹۰۶ء ص ۷۰ و ۷۱

سے بھی اس نے اصلاح لی ہے .... لطف کہتا ہے کہ بقا بارادۂ حج درمیان ۱۲۰۶ھ کے جانب حجاز کے گیا تھا۔ اسی سال میں درمیان راہ کے داربقا کو پہنچا۔[1]

شیفتہ نے بھی لکھا ہے کہ بقا، دردؔ کے شاگرد تھے۔ گلشنِ بیخار میں انھوں نے بقا کے طرزِ "بامزہ وشیریں" کی تعریف کی ہے:

"بقا۔ تخلص شیخ محمد بقاءاللہ خلف حافظ لطف اللہ خوشنویس اصلش از اکبرآباد ومنشاء آن لکھنؤ۔ خاطر ظرافت پسند داشت۔ بل از ظرافت درگزشتہ سر بہ ہجا کشیدہ۔ شریک دورہ میر و سودا و با انیان بیشتر طرف شدہ و ہجوہا گفتہ و در مراتب نظم طلبے شگفتہ و رنگین و طرزے بامزہ وشیریں داشتہ کمترک بقند پارسی ہم کام و زبان را حلاوت آگیں می نمودہ بپارسی شاگرد مرزا فاخر مکین و در ریختہ از تلامذۂ شاہ حاتم و خواجہ میر دردؔ غفر اللہ لہما نوشتہ اند۔"[2]

ڈاکٹر اشپرنگر نے لکھا ہے:

"بقا۔ شیخ محمد بقاءاللہ خاں ولد خوشنویس حافظ لطف اللہ خاں، ساکن آگرہ، یہ لکھنؤ میں رہتے ہیں اور مکین کے شاگرد ہیں (تذکرۂ علی ابراہیم) پہلے ان کا تخلص غمیں تھا؛ اور فارسی میں بھی نظمیں کہا کرتے تھے۔ مصحفی ان کے دوست تھے؛ اور ان کے بیان کے مطابق یہ ۱۲۰۹ھ میں زندہ تھے، اور لکھنؤ میں رہا کرتے تھے۔ عشقی بھی کہتے ہیں کہ جب انھوں نے اپنا تذکرہ لکھا تو یہ زندہ تھے۔ لیکن صاحب گلشن ہند کے خیال میں انھوں نے ۱۲۰۶ھ میں انتقال کیا۔"[3]

---

[1] تذکرۂ کریم الدین۔ نسخہ قدیمہ مطبوعہ دہلی ص ۲۰۰

[2] شیفتہ: گلشنِ بے خار نول کشور ص ۳۳

[3] اشپرنگر: یادگارِ شعرا مترجمۂ طفیل احمد ص ۳۹

عشقی نے ان کو "ادام اللہ بقاہ" لکھا ہے اور نام محمد بقا:

"بقا تخلص، دہلوی اسمش شیخ محمد بقا ادام اللہ بقاہ۔ مردے مستعد و خوشگو۔ از یاران میر غلام حسن، حسن تخلص است، مشق فارسی با استصلاح مرزا فاخر مکین می نماید و در طرز ریختہ نیز داد فصاحت و بلاغت می دہد۔ غرض کہ بالفعل در شہر لکھنؤ بزمرۂ معاصرین ہنگامہ سخنوری گرم دارد۔"[1]

منولال نے گلدستۂ نشاط میں بقا کا ایک شعر نقل کیا ہے:

ماہِ نو، انجم کے عقدے کس طرح سے وا کرے
ہوں جہاں لاکھوں گرہ واں ایک ناخن کیا کرے[2]

عشقی[3] اور لطف[4] نے بقا کا نام محمد بقا اور منولال نے میر بقا خاں[5] لکھا ہے۔ محمد حسین آزاد نے بقا کا نام وہی لکھا ہے جو عشقی نے اور ان کو فارسی میں مرزا فاخر مکین اور اردو میں شاہ حاتم کا شاگرد قرار دیا ہے۔ آب حیات کی رو سے ان کا مولد دہلی اور اکبر آباد وطن تھا۔ وہ لکھنؤ میں جا بسے تھے اور میر و سودا دونوں

---

[1] عشقی: بحوالہ دو تذکرے مطبوعہ پٹنہ ص ۹۲

[2] منولال: گلدستہ نشاط: مطبوعہ کلکتہ ۱۸۳۶ء ص ۳۹۶

[3] عشقی (پٹنہ) ص ۹۲

[4] لطف: گلشن ہند۔ ص ۷۰

[5] منولال: گلدستہ نشاط ۱۸۳۶ء ص ۳۹۶

خاطر میں نہ لاتے تھے[1]

یکتا[2] اور لطف[3] دونوں کا یہ بیان ہے کہ بقا کو جنون ہی کی حالت میں کربلائے معلیٰ
نجفِ اشرف کی زیارت کا شوق ہوا لیکن اثنائے راہ میں انتقال کیا۔ لطف نے
اس سفر کی تاریخ سنہ ۱۲۰۶ھ دی ہے اور یہی ان کی رحلت کی تاریخ ہے لیکن تذکرۂ
گلرو شن میں ہے کہ "تا سال بستم از مائۃ سیزدہم در قید حیات بود"۔

بقا صفِ اول کے شعرا میں نہیں ہیں۔ میر و سودا کے آگے ان کا چراغ نہ جل
سکا۔ اپنا لوہا منوانے کے لیے انھوں نے ان استادوں کے رنگ میں کہنے کی کوشش
کی۔ جن جب ان کی ہم سری نصیب نہ ہو سکی تو ان کی ہجویں کہیں اور اپنے دل کا
بخار خوب خوب نکالا۔ بقا اس نکتے کو نہیں سمجھے کہ میر کے فکر و فن میں جو وحدت ہے
اس کے لب و لہجے میں جو بلند سنجیدگی اور ماورائی سادگی ہے وہ "زورِ بازو" سے
پیدا نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح سودا کی عظمت کا راز صرف یہ نہیں ہے کہ انھوں نے
شاخ زمینوں کو پانی کر دیا ہے بلکہ ان کی بڑائی، ان کی دیدہ وری، ان کے
لاشعور اور سماجی احساس میں پوشیدہ ہے۔ بقا نے سودا کی ریس میں مشکل
زمین میں شعر کہے (بقول اُن کے "رشکِ غزل سودا") لیکن بعض مہمل ہو کر رہ
گئے۔ ان کے عالمِ خیال کا مدعا عنقا ہی رہا۔ بقا نے پردے کے نقش و نگار کو
خوب باور کر لیا۔ اس کے پیچھے جو معنی کا جلوہ ہے اسے نہیں دیکھا۔ اُن کی اِس
غزلیں محض لفظی بازی گری کا نمونہ ہیں:

---

[1] : آبِ حیات طبعِ لاہور ص ۱۵۴۔ حاشیہ۔

ص ۸۰ و ۸۱

ص ۷۰ و ۷۱

ع قاتل جو ملے مجھ سے کفن نذر پکڑ کر

ع جو چشم و دل سے چڑھا دوں نالے، بہ آب اول دوم بہ آتش

ع کر کے باتابِ نگہ یاں تن و آتش کو بہم

ع میری گو آہ سے جنگل نہ جلے، خشک تو ہو

اور اس بات کو بھی ظاہر کرتی ہیں کہ وہ اسلوب جو انشاؔ، ناسخ اور نصیرؔ سے منسوب کیا جاتا ہے، اس کا پہلا نقش سوداؔ اور بقاؔ ہی کی بدولت صورت پذیر ہوا۔

بقاؔ میرؔ کے زمانے میں شعر کہہ رہے تھے جو خدائے سخن ہیں۔ وہ سوداؔ کے زمانے میں سخنوری کر رہے تھے جو طنز کے بادشاہ اور قصیدے میں انوری و خاقانی کے ہم رتبہ ہیں۔ ان استادوں کے آفتابِ کمال کے سامنے معمولی ستاروں کا بے نور ہو جانا حیرت انگیز نہیں۔ حیرت انگیز ان کے بعض غزلیہ اشعار ہیں۔ ملاحظہ ہوں

عشق میں بُو ہے کبریائی کی — عاشقی جس نے کی، خدائی کی
ہمسری مت صبا سے کر اے آہ — تو نے بھی کچھ گرہ کشائی کی
لے چلے ہم قفس سے اے صیّاد — خاک میں آرزو رہائی کی
روزِ محشر تلک نہ آخر ہوں — داستانیں شبِ جدائی کی

راستی پر ہم سے کس دن آئیاں — یار کی زلفیں جو ہیں بل کھائیاں
مرحبا رو رو کے اے ابرِ مژہ — روز ساون کی رتیں دکھلائیاں
جل کے خاکستر ہوا غم سے بقاؔ — اے میاں اتنی بھی بے پروائیاں

دیکھ آئینہ جو کہتا ہے کہ اللہ رے میں — اس کا میں دیکھنے والا ہوں بقاؔ، واہ رے میں

غیر بدوضع ہیں، محفل سے شتاب ان کی اُٹھو — پاس ایسوں کے تم اے جان بھلے بیٹھ گئے
اتواں ہم ہوئے یاں تک کہ تری محفل تک — گھر سے آتے ہوئے سو بار چلے بیٹھ گئے

ل میاں سچ ہے تمھاری تو بلا ہی جانے — جو گزرتی ہے مرے دل پہ خدا ہی جانے
ل کی واشد پہ عبث آہ نے کھینچی تکلیف — کھولنے عقدے تو غنچوں کے صبا ہی جانے
م تو نت دور سے خمیازہ کشِ حسرت ہیں — لذتِ بوس و کنار اس کی حیا ہی جانے
رے بیمار کو کیا ہوئے شفا جس کے طبیب — نہ تو کچھ درد کو سمجھے، نہ دوا ہی جانے
در پر اپنے سخن کون برا کہتا ہے — پر یہ انداز جو پوچھو تو بقا ہی جانے

ان غزلوں سے بھی زیادہ حیرت انگیز بقا کے قصائد ہیں جو الفاظ کی شوکت شبیہات کی لطافت اور تراکیب کی خوش نمائی سے خالی نہیں ہیں۔ یہاں سودا ے رخِ روشن کے آگے شمع رکھنا یا بقا کا ان سے مقابلہ کرنا غلط ہوگا مگر جو قصیدے ں مختصر سے مجلّد میں شامل ہیں وہ شان و شوکت اور متانت و جزالت میں ند پایہ نہ سہی لیکن پڑھنے کے قابل ضرور ہیں۔ خاص طور پر ان دو قصیدوں ی تو انھوں نے شاندار الفاظ اور باوقار تشبیہات کا انبار لگا دیا ہے :

۱- جب مری چشم گئی نیند سے کل رات جھپک۔
۲- کل حضرتِ بقا سے کیا میں نے یہ سوال

بقا کی ہجویات بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتیں۔ وہ میر و سودا دونوں کی عری کے منکر تھے۔ چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں :

کھول دیوان دونوں صاحب کے — اے بقا ہم نے جب زیارت کی
شعر سودا و میر کے دیکھے — وہ تو "تو تو" کریں ہیں" یہ "ہی ہی"[1]

آزاد نے لکھا ہے کہ سودا اور مرزا فاخر کے معرکے میں بقاءاللہ خاں بقا درمیان میں پڑے کہ زبانی پیاموں سے عبرت الغافلین کے داغوں کو دھوئیں جس میں سودا نے مرزا فاخر کی غلطیوں اور غلط فہمیوں کو ظاہر کیا تھا۔ فاخر کا ایک شعر ہے ؎

گرفتہ بود دریں بزم چوں قدح دلِ من　　شگفتہ روئے صہبا شگفتہ کرد مرا

سودا کو اعتراض تھا کہ قدح کو گرفتہ دل کہنا بے جا ہے۔ اہلِ انشا نے ہمیشہ قدح کو کھلے پھول سے تشبیہ دی ہے یا ہنسی سے۔ آزاد لکھتے ہیں۔" بقا نے جواب میں شاگردی کا پسینا بہت بہایا اور اخیر کو باذل کا ایک شعر بھی سند میں لائے ؎

چہ نشاط بادہ بخشد بمنِ خراب بے تو　　بہ دلِ گرفتہ ماند قدحِ شراب بے تو

مرزا رفیع سن کر بہت ہنسے اور کہا کہ اپنے استاد سے کہنا کہ استادوں کے شعروں کو دیکھا کرو تو سمجھا بھی کرو۔ یہ شعر تو میرے اعتراض کی تائید کرتا ہے۔ یعنی باوجودیکہ پیالہ ہنسی اور شگفتگی میں ضرب المثل ہے اور پیالۂ شراب سامانِ نشاط ہے مگر وہ بھی دلِ افسردہ کا حکم رکھتا ہے[1]

آزاد نے میر و بقا کے معرکے بھی بیان کیے ہیں اور میر کے ترجمے میں بقا کے یہ دو شعر نقل کیے ہیں :

اِن آنکھوں کا نت گریہ دستور ہے　　دو آبہ جہاں میں یہ مشہور ہے
سیلاب سے آنکھوں کے رہتے ہیں خرابے میں　　ٹکڑے جو مرے دل کے بستے ہیں دو آبے میں

اس پر آزاد لکھتے ہیں کہ میر صاحب نے خدا جانے سُن کر کہا یا تو ارد ہوا :

وے دن گئے کہ آنکھیں دریا سی بہتیاں تھیں
سوکھا پڑا ہے اب تو مدت سے یہ دو آبہ

---

[1] آبِ حیات طبع لاہور ص ۲۲۰

اس پر بقا نے جو قطعہ کہا تھا وہ اوپر نقل ہو چکا ہے۔

آزاد نے بقا کے چند اور شعر بھی نقل کیے ہیں. جن میں میر پر کھلی چوٹیں ہیں[1]

میر صاحب پھر اس سے کیا بہتر — اس میں ہووے جو نام شاعر کا
لے کے دیواں پکارتے پھریے — ہر گلی کوچہ "کام شاعر کا"

توبہ زاہد کی توبہ تلّی ہے — چلے بیٹھے تو شیخ چلّی ہے
پگڑی اپنی سنبھالیے گا میر — اور بستی نہیں یہ دلّی ہے

بقا نے میر پر سرقے[2] کا الزام لگایا ہے۔ ان کے یہاں جو "کثرتِ یک لفظ"[3] ہے، اس کا مذاق اُڑایا ہے، ان کی سیادت[4] پر اعتراض کیا ہے، ان کی خوے زشت[5] اور طبعِ عجیب کو لایقِ ملامت ٹھہرایا ہے۔ لیکن بقا کی ہجویات کے ہدف میر ہی نہیں، سودا بھی تھے اور بعض جگہ انھوں نے دونوں کو لپیٹ میں لے لیا ہے:

مرزا و میر باہم دونوں تھے نیم مُلّا — فنِ سخن میں یعنی ہر ایک تھا ادھورا
اس واسطے بقا اب ہجوں کی ریسماں سے — دونوں کو باندھ باہم میں نے کیا ہے پورا

---

[1] آبِ حیات ص ۲۲۰ کلیاتِ بقا ص ۷۵ تا ۸۰
[2] دیوانِ بقا ص ۷۵ و ۷۸
[3] ایضاً ص ۷۹
[4] ایضاً ص ۷۹
[5] ایضا ص ۷۶

طرفہ لطیفہ ہے کہ کلیاتِ سودا میں بقا کے خلاف کوئی ہجو نہیں ہے۔ اس خاموشی سے غالباً ان کا مقصد یہ تھا کہ بقا کو اہمیت نہ دی جائے۔ لطف نے سودا کا ایک قول بھی نقل کیا ہے:

"میں نے جس کی ہجو کی، نام اس کا اسی تقریب سے تمام عالم میں ہوا مشہور ہے۔ سو تیری ہجو نہ کروں گا کہ تیرا مشہور کرنا مجھے نہیں منظور ہے۔"[1]

بقا کی ہجویات میں وہ وسعت نہیں ہے جو سودا کے یہاں ہے۔ بقا نہ معاشرے کی خرابیوں پر انگشت نمائی کرتے ہیں، نہ حکومت کے زوال و انحطاط کی کہانی سناتے ہیں۔ ان کا دائرۂ فکر تنگ ہے۔ ان کی ہجویات شخصی ہیں اور ذاتی اختلافات کا نتیجہ ہیں لیکن وہ تخئیلی اور تخلیقی ظرافت کے عناصر سے عاری نہیں ہیں اور ان کا مطالعہ میر اور عہدِ میر کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے۔

یکتا کا بیان ہے کہ بقا کے دو ہزار اشعار لوگوں میں مشہور ہیں۔ علی ابراہیم خاں (اور لطف) نے جو اشعار دیے ہیں، وہ بھی وہ ہیں جو ان کے گوشۂ خاطر میں محفوظ تھے۔ آخر میں تو وفورِ دیوانگی میں یہ حال ہو گیا تھا کہ اپنے کلام کو پارہ پارہ کر کے اور ایک بوچے میں پانی ڈال کے رکھ لیا تھا اور جو طالبِ شعر آتا، اس سے کہتے اس میں میرا پورا کلیات ہے، جو چاہے لکھ لو لیکن خدارا ہجویات نہ لکھنا اس لیے کہ میں نے اس سے توبہ کر لی ہے!

ان حالات میں دیوانِ بقا کے قلمی نسخے کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ ہم نے جو نسخہ شائع کیا ہے وہ ڈاکٹر اشپرنگر کے ذخیرۂ مخطوطات کی زینت رہ چکا ہے اور پہلی مرتبہ منظرِ عام پر آیا ہے۔

---

[1] لطف : گلشنِ ہند ص ۱۷

اِس نسخے کا ترقیمہ یہ ہے :

"تمام شد دیوان ہندی تصنیف بقا بتاریخ بست یکم شہر ذی الحج سنہ ۱۲۴۱ھ روز جمعہ"۔

کاتب کا خط بہت اچھا ہے لیکن بلا کا غلط نویس ہے۔ اسی لیے متن کے تیار کرنے میں بہت سی دشواریاں پیش آئیں۔ اس کام میں پروفیسر ضیاء احمد بدایونی اور جناب رشید حسن خاں نے بڑی جان کھپائی ہے اور میں ان دونوں حضرات کا بے حد ممنون ہوں۔ جہاں الفاظ پڑھنے میں نہیں آئے وہاں نقطے لگا دیے ہیں یا خط کھینچ دیا ہے۔ بقا کے جو اشعار مختلف تذکروں میں ملتے ہیں ان سے مقابلہ بھی کر لیا گیا ہے۔ اس کلیات کی طباعت میں مولانا امیر حسن نورانی نے جو تکلیف اٹھائی اس کا بھی شکر گزار ہوں۔

خواجہ احمد فاروقی

مخفّفات

ن : مجموعۂ نغز	ل : گلستانِ بے خزاں
م : تذکرۂ میر حسن	ش : گلشنِ بے خار
ہ : تذکرۂ ہندی	ک : کریم الدین
گ : گلِ رعنا	آ : آبِ حیات
ز : گلزارِ ابراہیم	شع : شعر الہند
د : دستور الفصاحت	مج : مجمع الانتخاب قلمی
ع : تذکرۂ عشقی	س : انتخابِ حسرت موہانی

سخ : سخنِ شعرا

دیوانِ بقا

غزلیات

طور پر اپنے سخن کون بُرا کہتا ہے

پر یہ انداز جو پوچھو تو بقاؔ ہی جانے

وہ انگارا ہے پہلو میں دلِ بیتاب، آتش کا
کہ دیکھے سے جسے ہو جائے زہرہ آب آتش کا

دلِ بیتاب چھٹ اپنے، کہ سوزِ غم سے خوگر ہے
نہ دیکھا ہم نشیں ہوتے کہیں سیماب آتش کا

جلا کرتے ہیں تربت میں بھی ہم دل تفتگاں، سچ ہے
جلا آتش کا جو ہوئے، سو دیکھے خواب آتش کا

بڑے اُستادِ غم سے، مکتبِ ہستی میں، ہم پیارے
کتابِ چار عنصر سے، پڑھے ہیں باب آتش کا

بقا نے روز و شب رو رو کے، آبِ چشم سے اپنے
نشاں آخر کو عالم میں کیا نایاب آتش کا

قضا نے حالِ کُل، جب صفحۂ تقدیر پر لکھا
مری دیوانگی کا ماجرا زنجیر پر لکھا

ضعیفی سے نہیں پیروں کے چیں پیشانیِ رو پر
یہ خطِ نا امیدی ہے کہ رشتے پیر پر لکھا

نہیں تجھ سے ہمیں دعوائے خوں، گر شمع نے، قاتل
اب اپنے خوں کا محضر گردنِ گلگیر پر لکھا

یہ سب مضموں ہے شیریں، کوہکن کی روسپیدی کا
جہاں تک موج نے سطروں کو جوئے شیر پر لکھا

بقا کے دل میں آ، آئینہ تیری قدر کیا جانے
عبث ہے نقشِ گُل گر بلبلِ تصویر پر لکھا

خالِ لب آفتِ جاں تھا، مجھے معلوم نہ تھا
دام، دانے میں نہاں تھا، مجھے معلوم نہ تھا

خواہشِ سُود تھی، سودے میں محبت کے، ولے
سر بسر اُس میں زیاں تھا، مجھے معلوم نہ تھا

باتوں باتوں میں مرے سر کو کٹا دے گا رقیب
اس قدر سیف زباں تھا، مجھے معلوم نہ تھا

میں تو آیا تھا بقا باغ میں، سُن جوشِ بہار
پر یہ ہنگامِ خزاں تھا، مجھے معلوم نہ تھا

دستِ ناصح جو مرے جیب کو اِس[۱] بار لگا
پھاڑوں ایسا کہ پھر اُس میں نہ رہے تار لگا

پہنچی[۲] اُس بُت کو خبر نالۂ تنہائی کی
مدّعی کون کھڑا تھا سرِ[۳] دیوار لگا

مرضِ عشق تمھارا تو یہ طوفاں ہے، کہ میں
جس سے مذکور کیا، اس کو یہ آزار لگا

جس کا مَلّاح بنا عشق، وہ کشتی ڈوبی
اُس کے کھیوے سے تو بیڑا نہ کوئی پار لگا

مرغِ زیرک تھے، تہِ دام نہ آئے ہرگز
اُڑ گئے ہم سرِ صیّاد پہ منقار لگا

دردِ یہ دل میں اُٹھا رات، کہ ہو گرمِ تپش
اُڑ گیا سوئے فلک میں پرِ احرار لگا (کذا)

پردۂ خاک سے دی مجھ کو کسی نے آواز
گور ہموار تھی سننے جو میں، یار لگا (کذا)

پھر تو غفلت زدہ تا خوابِ عدم ہے یاں تو
دیکھ لے ہم کو نہ ٹک دیدۂ بیدار لگا

جب[۴] میں دیکھوں ہوں تو کثرت ہی خریداروں کی
گھر میں اس غیرتِ یوسف کے ہے بازار لگا

کھینچ پیچھے کو قدم آہ میں یاں تک رویا
کہ مرے آگے بقاؔ دُر کا اک انبار لگا

کعبہ تو سنگ و خشت سے اے شیخ مل بنا
کچھ سنگ بچ رہا تھا، سو[۵] اُس بُت کا دل بنا

اتنا ہوا ضعیف کہ میرے مزار پر
جو برگِ گل پڑا ہے، سو چھاتی کا سِل بنا

ہو کر سیہ بقاؔ کا ستارہ نصیب کا
روزِ نخست عارضِ خوباں کا تل بنا

۱؎ ش، ک : یک بار۔ سنخ: جیب ناصح جو مرے ہاتھ کو اک بار لگا۔ ۲؎ ہ: یار کو بھیجی خبر۔ د، گ، ش، ک : یار کو پہنچی خبر

۳؎ ہ، د، ش، ک، س : پسِ دیوار

۴؎ س۔

۵؎ س : سو عاشق کا دل بنا

سیکھا جو قلم سے نےِ حنالی کا بجانا
کر نغمہ بقاؔ فکرتِ عالی کا بجانا

تسمہ مرے مست دل پہ دوالی کا بجانا
یہ لٹ جو ہے، چابک اسی کالی کا بجانا

مارا کیے مطرب بچگاں دل پہ تھپیڑے
سیکھے اسی طبلے پہ وہ تالی کا بجانا

الفت میں تری اے بُتِ بے مہر و محبّت
آیا ہمیں اک ہاتھ سے تالی کا بجانا

لے مول مرے دل کا وہ جب [ساغرِ نازک]
یاد آوے نہ کاش اُس کو سفالی کا بجانا

اس نالۂ بے صوت نے حیرت میں سکھایا
سازاب مجھے تصویرِ نہالی کا بجانا

بس اے غمِ غمّاز، مری آہِ جگر سے
آفت ہے ترا بام پہ تھالی کا بجانا

بے ساقی و مے، سوچ میں، ہے کام ہمارا
بیٹھے سرِ ناخن سے پیالی کا بجانا

اُس کودکِ بے ہوش کا، آفت ہے، شب اُٹھ کر
ٹھیکوں پہ مری آہ کے، تالی کا بجانا

سنتا ہوں کسی پوچ کی جب دف زنیِ فکر
آتا ہے مجھے یاد ڈفالی کا بجانا

کرتا ہے بقاؔ نالہ، تو کر جھانج میں دل سے
بے جھانج ہے کیا اِس دفِ خالی کا بجانا

قلم صفت میں پس از مراتب بدن ثنا میں تری کھپایا
بدن زباں میں، زباں سخن میں، سخن ثنا میں تری کھپایا

بہ رنگِ شمع و دراوِ خامہ، ترے طریقِ ثنا کا جویا
کبھی ہے ساکت، کبھی ہے نالاں، کبھی ہے راقم، کبھی ہے گویا

چھلک کے دیدۂ تر ہے مُغاں! پیالا سا
بغل میں پھوٹ بہا شیشہ دل کا چھالا سا

کل[۱] دستِ محتسب سے جوں توں مجھے چھڑایا شیشے نے میری خاطر اپنا گلا بندھایا

اُس[۲] کف میں دیکھ ساغرِ نازک شراب کا دریا میں سرنگوں ہے پیالہ حباب کا

ہم[۳] نفس کوئی نہ دیکھا بے کسی کے دن بقاؔ آشنا صورت مگر معنی میں وہ بے گانہ تھا

سرسری[۴] مل کے، مرے پاس سے جانا کیا تھا راہ بس ناپنے آئے تھے، یہ آنا کیا تھا

شب اوس شکر لب کی کروں یاد میں گر خواب تو خواب نہ آوے، مگر آوے تو شکر خواب

مت تنگ ہو، کرے جو فلک تجھ کو تنگ دست آہستہ کھینچیے، جو دبے زیرِ سنگ، دست

گہے حنا سے، گاہ مرے خوں سے سرخ ہو سو سو طرح سے، اُس کے دکھاتے ہیں رنگ، دست

دیتا ہے کف سے دولتِ پابوس شمع کی روئے گا سر پہ دھر کے پھر آخر تپنگ، دست

بھر آنکھ تجھ کو غیر نے دیکھا، تو پھر مرے لیویں گے انگلیوں ہی سے کارِ خدنگ، دست

جز کُشت و خونِ بے گنہاں، آستیں سے تو باہر نکالتا ہے کب اے خانہ جنگ، دست

مفت اس کے ہاتھ اب جو بقاؔ سا لگے شکار
پھر کب کرے قصور یہ چرخِ پلنگ دست

غم[۵] میں اُس زلف و رخ کے ہم ہیہات رات کو دن کریں ہیں، دن کو رات

۱؎ م ۲؎ ن ۳؎ گ ۴؎ سخ

۵؎ مخطوطے میں اس غزل پر یہ عنوان لکھا ہوا ہے: "استدعاے بوسہ از شیخ جی" عنوان بظاہر غیر ضروری معلوم ہوتا ہے اس لیے متن میں نہیں لکھا گیا۔

کیوں نہ شانے سے دب چلیں یہ شوخ
جن کی چوٹی لگی ہے اُس کے ہات

چڑھ کے اسپِ اجل پہ، ہستی سے
شیخ جی لے گئے عدم کو برات

عکسِ حق ہوں جہاں کے آئنے میں
میری اور اُس کی ایک ہیں حرکات

چاہیے ٹک اُدھر سے حُسنِ قبول
پھر تو ہیں سیّآت بھی حسنات

اُس خطِ پشتِ لب نے چھوڑا ہے
آبِ حیواں پہ پردۂ ظلمات

بوسہ دینے میں لب کے سوچ مت
ہے یہ حق میں بقا کے آبِ حیات

دل دیکھ کے رہتا ہے ہر آن تری قدرت
دُرّاج صفت گویاں، سبحان تری قدرت

ہم کو جو کچھ مفید جہاں کا نہیں علاج
شاید مریضِ چشمِ بتاں کا نہیں علاج

نکلے ہے منہ سے بات بہ لکنت ترے حضور
گو دل رہے بجا، پہ زباں کا نہیں علاج

بے کل رہے ہے نت کے لچکنے سے وہ کمر
اُس مومیاں کے موے میاں کا نہیں علاج

کہتا ہے دق ہو، غنچۂ گل سے، وہ خوش دماغ
دنیا میں تجھ سے گندہ دہاں کا نہیں علاج

سُن دردِ دل کو میرے لگا کہنے یوں طبیب
ہر درد کی دوا ہے، پہ یاں کا نہیں علاج (کذا)

لاؤں جو شکوۂ شبِ ہجراں سخن کے بیچ
جوں شمع پھر زباں نہ سماوے دہن کے بیچ

اِس باغ میں شگوفۂ نورس تو ہوں، ولے
سو چاک مثلِ گل ہیں مرے پیرہن کے بیچ

کھا لالہ داغ، صحنِ چمن سے نکل گئے
خونیں دلوں کو چین کہاں ہے وطن کے بیچ

لے جا کے بوے زلف تری، بادِ صبح نے
خوں کر دیے ہیں نافۂ آہو، ختن کے بیچ

اِتنا گھُلا ہوں حسرتِ دیدار سے کہ اب
جز چشم کچھ رہا نہیں باقی بدن کے بیچ

جلدی پہنچ کہ اشک کے دریا میں جوں حباب
دم آ رہا ہے یار ہمارا نین کے بیچ

یکتائے روزگار بھی ہو، تا بقا تجھے (ق)
پہنچے کمال مرتبہ شعر و سخن کے بیچ

یک شعر مثلِ دردِ تو ہرگز نہ کہہ سکے
ہر مو اگر زبان ہو تیرے بدن کے بیچ

اے جنوں! یمنِ قدم سے ترے، اک آن کے بیچ
پڑ گئی لاگ مرے دست و گریبان کے بیچ

تشنہ کاموں سے نہ مُنہ موڑ کہ جب خط آیا
پھر تو یہ آب کہاں چاہِ زنخدان کے بیچ

خونِ عاشق کے لیے سحر ہے یہ سرخیِ لب
کیا کھلایا ہے رقیبوں نے تجھے پان کے بیچ

آ کے کرتا ہے خلل شانہ، جو عشّاق کے دل
جمع ہوتے ہیں تری زلفِ پریشان کے بیچ

کیوں نہ گردش میں رہے، ہم سا جو کوئی آوارہ
خاک ہو کر ہو ملا ریگِ بیابان کے بیچ

بانگِ تکبیر تو ایسی ہے بقا سینہ خراش
انگلیاں آپ مؤذّن نے دھریں کان کے بیچ

مے، خون کی جا، اپنی تو رگ رگ میں رہی پچ
زاہد ہی کوئی خشک ہے جو اس سے گیا بچ

یوں دل شدۂ نالاں ہیں ترے جلوے کے ہنگام
جوں موسمِ گُل بلبلوں میں دھوم رہے مچ

بے خال، تری زلف میں کب دل ہو گرفتار
جو مرغ پھنسے دام میں، دانے ہی کی لالچ

تل دھرنے کی جا گہ نہیں اِن میں ہے، چہ جا دل
زلفوں میں بھرے ہیں تری، دل ایسے مچا مچ

ہے جیسی بقا کی غزل، ایسی نہ ہو مضبوط
سودا جو کوئی ریختے کے گھر پہ کرے گچ

ن : اب جنوں۔

کھب گئی چشم میں جب سے کمرِ یار کی طرح
رگِ گل دل میں کھڑکتی[1] ہے مرے خار کی طرح

ہائے کیا درد ہے سینے میں دلِ محزوں کو
رات دن اب تو کراہے ہے یہ بیمار کی طرح

دید کو تیری، شب و روز کھلی رہتی ہیں
چشمِ حیرت زدگاں، رخنۂ دیوار کی طرح

تو وہ یوسف ہے کہ دن رات خریداری کو[2]
آمد و رفت ترے گھر میں ہے بازار کی طرح

پہلے جو پانو تری سمت پڑے، اُس پہ بقاؔ
دوسرا پانو تصدّق کرے، پرکار کی طرح

رکھتا تھا جب کہ اشکِ جہاں گرد رنگِ سُرخ
ہر دشت، لالہ زار تھا۔ ہر کوہ، سنگِ سُرخ

دل خوں ہے غم سے اور جگر، یک نشد دو شد
لب خشک ہیں تو چشم ہے تر، یک نشد دو شد

رسوا تو نالہ کر کے ہوئے، لیکن اُس نے یار
دل میں ترے کیا نہ اثر، یک نشد دو شد

اول تو ہم کو طاقتِ پرواز ہی نہ تھی
تس پر بُریدہ ہو گئے پر، یک نشد دو شد

پایا نہ ہم نے سود محبّت میں یار کی
اس پر بھی پہنچتا ہے ضرر، یک نشد دو شد

چھڑکا مرے جگر پہ نمک، غیر سے رہا
پیوستہ مثلِ شیر و شکر، یک نشد دو شد

آوارہ جوں صبا ہوں، پر اب جستجوے یار
رکھتی ہے مجھ کو خاک بسر، یک نشد دو شد

مشکل تھا دیکھنا ہی ترا، تس پہ روزِ وصل
لائی نہ چشم تابِ نظر، یک نشد دو شد

نالاں ہم اپنے اشک کے ہاتھوں تھے، اب بقاؔ
بہنے لگیں ہیں لختِ جگر، یک نشد دو شد

---

[1] ن، س: کھٹکتی ہے
[2] ن: خریداروں کی

رکھتا ہے یوں وہ زلفِ سیہ فام دوش پر
صیّاد جس طرح سے دھرے[1] دام دوش پر

شانے تلک چڑھے بِن، اب آنسو کو کب ہے چین
سچ ہے کہ ہووے طفل کو آرام دوش پر

اک دن ملا جو شیخ، تو پھر میکشوں کے ساتھ
سر پر لیے پھرے گا سبو، جام، دوش پر

ملنا تو آج بھی نہ ہوا شب کو (اور) اُٹھا
ایفائے وعدہ، اے بتِ خود کام دوش پر

ہے دل میں، گھر کو شہر سے صحرا میں لے چلیں
اٹھوا کے آنسوؤں سے در و بام دوش پر

وہ زشت بخت ہوں کہ ملائک کو بھی مرے (ق)
لکھنے کا پیش آئے جو کچھ کام دوش پر

نیکی مری تو نام بدوں کے کریں رقم
زشتی لکھیں بدوں کی مرے نام، دوش پر

مطرب بچوں نے شیخ کو ٹنگیا لیا تمام
لی وقت جائے خلعت انعام دوش پر (کذا

ڈالا نہ بارِ عشق زمیں پر بقاؔ نے یار
سر سے اگر گرا، تو لیا تھام دوش پر

آوے جو ناز سے مرا وہ بتِ سیم بر بہ بر
کاہے کو لے پھرے مجھے میرا نصیب دربدر

چشم بہ چشم، رو بہ رو، سینہ بہ سینہ، دل بہ دل
ساق بہ ساق و لب بہ لب، پائے بہ پائے، سر بہ سر

تم تو رہو ہو مہرباں غیر کے ساتھ اس طرح
اور میں پھروں ہوں خوار و زار، خانہ بہ خانہ، گھر بہ گھر

اے بتِ مہر وش کبھی ٹک تو نگاہِ گرم ہو
اشک سے کب تلک رہیں دامن و جیب تر بہ تر

دامِ بلا سے اب بقاؔ ہم سے اسیر کب چھٹیں
رشتۂ غم سے گتھ گئے بال بہ بال، پر بہ پر

نہ لے اس دل کو نظروں میں جھپٹ کر
مبادا یہ لگے جادو پلٹ کر

---

[1] س: رکھے

کرے مژگاں سے کب تک نیزہ بازی
وہ غمزہ ناز کا مرکب ڈپٹ کر

ہوا الماسِ غم سینے میں کاری
جگر بہتا ہے چشمِ تر سے کٹ کر

گدازِ غم سے ان لیلیٰ وشوں کے
ہوا ہوں بیدِ مجنوں، غم سے لٹ کر

گڑی ہے میخ دیں کعبے کے در پر
مبادا گر پڑے زاہد اُلٹ کر

ہماری چشمِ تر کے گھر سے یارب
کہاں جاتا ہے طفلِ اشک ہٹ کر

شبِ فرقت میں چشمِ تر کا دریا
ہوا پل بند، لختِ دل سے پٹ کر

نہ نیند آتی ہے، نے گرتا ہے سر سے
عروسِ صبح کا مقنع اُلٹ کر

بقاؔ، روشن چراغِ چشمِ تر رکھ
فتیلہ رشتۂ مژگاں سے بٹ کر

~~فتیلہ رشتۂ مژگاں سے بٹ کر~~

قاتل جو ملے مجھ سے کفن نذر پکڑ کر
دھردوں میں چھری اور لگن نذر پکڑ کر

وہ شامِ غریباں ہے تری زلف کہ جس سے
رخسار ملا صبحِ وطن نذر پکڑ کر

ناگن کے تصور میں تری زلف سے آکر
کالے بھی جو ملتے ہیں تو من نذر پکڑ کر

نکہت پہ تری زلف کی ملتے ہیں صبا سے
نافے کو سب آہوے ختن نذر پکڑ کر

دریا پہ دمِ گریہ مری چشم سے آکر
ملتی ہے صدف، دُرِّ عدن نذر پکڑ کر

تیرے دہنِ تنگ سے ہنگامِ تبسّم
ہر غنچہ ملا دل بہ دہن نذر پکڑ کر

گردش سے تری نرگسِ فتّاں کی زمانہ
آخر کو ملا اپنا چلن نذر پکڑ کر

وہ ماہِ محرم تری ہجرت ہے کہ جس سے
ہجرت کا محرم ملے سن نذر پکڑ کر

تو یار وہ گل ہے کہ ترے سامنے آوے
منقار میں گُل مرغِ چمن نذر پکڑ کر

اُس زلفِ شکن دار سے دل ہائے شکستہ
ملتے ہیں بہم اپنی شکن نذر پکڑ کر

جس دم ملے تجھ سے کوئی عاشق تنِ بے جاں (ق) اپنا تن و جاں سرّ و علن نذر پکڑ کر

تو اُس کے تن و جاں سے ترے سامنے آوے
تن جان کو اور جان کو تن نذر پکڑ کر

ہم طائرِ نو گلشنِ دنیا میں ہیں صیّاد
مت ہم سے تو مل دامِ کہن نذر پکڑ کر

جب دَر نہ پڑے رم میں، تو آخر کو ہوئے رام
وحشت تری آنکھوں کو ہرن نذر پکڑ کر

تو سن پہ تجھے دیکھے تو ..... آوے
ہاتھوں میں صبا بوے سمن نذر پکڑ کر

.....
.....

اب کیونکے رہوں شہر میں بے یار کہ وحشت
آئی ہے مرے سامنے بن نذر پکڑ کر

گردوں پہ فقط لے گئے سر اپنا مہ و مہر
قاتل کو زمیں بیچ بدن نذر پکڑ کر

دیکھے لبِ لعل اُس بُتِ ہندی کا تو اس کو
دل، جائے عقیق، آئے یمن نذر پکڑ کر

اُس ظالمِ بیدرد سے ہم دردِ دل اپنا
کہتے ہیں ولے چوب و رسن نذر پکڑ کر

پاتا ہوں دمِ فکرِ بقا بات میں میں بات
ملتا ہے سخن مجھ سے سخن نذر پکڑ کر

اُس صیدفگن نے جو دھرا دام زمیں پہ
اک صید کا ہرگز نہ رہا نام زمیں پر

گردوں پہ گیا دور میں اُس لب کے مسیحا
یعنی[1] کچھ اب اُس کا نہ رہا کام زمیں پر

شیشہ تو فلک پر ہے سدا جام زمیں پر

تُرکی[2] اُس چشم کی ہے ابروے خمدار کے زور
چھین لیتی ہے دلِ خلق وہ تلوار کے زور

---

[1] ن : یعنی کہ

[2] و

مجھکو نہ اب دل ہے نہ جاں ہے عزیز
پر وہ بتِ جانِ جہاں ہے عزیز

غیر سے کہتا ہے مرے حق میں یار (ق)
دیکھو[1] تو اِس دم وہ کہاں ہے عزیز

در پہ جو بیٹھا ہو تو اُس سے کہو
جائے، جو اپنی اُسے جاں ہے عزیز

پر اُسے معلوم نہیں ہے کہ جان
عاشقِ بیدل کو کہاں ہے عزیز

مجکو[2] بقا بہرِ سخن خامہ وار
سارے بدن میں یہ زباں ہے عزیز

سب رنگِ عاریت وہ سمجھتا ہے ننگِ ناز
بہتر ہزار رنگ سے اُس کا ہے رنگِ ناز

نچلا رہا کبھو نہ مرا طفلِ نے سوار
کرتا ہے شوخیوں سے نت اُٹھ کر (وہ) ثنگِ ناز

دامن نہ چھوڑوں میں، تو چھڑاوے جھٹک جھٹک
کرتی ہے مجھ کو قتل اب اُس کی یہ جنگِ ناز

برخود غلط ہمیں ہیں، کچھ اُس کا نہیں قصور
یاں وقفۂ نیاز ہے، واں ہے درنگِ ناز

ہے سخت رو بہت پسرِ شیخ، دیکھیے
پڑتا ہے کس کے شیشۂ دل پر یہ سنگ ناز

ہے مجھ نیاز مند کو کچھ اور ہی اُمنگ
یارو، میں کیونکے شعر میں باندھوں امنگِ ناز

شوخی پہ ہے کمیتِ قلم، اس کو پھر بقا
جولاں دے اس زمیں میں ذرا کس کے تنگِ ناز

میں ہوچکا ہوں یار نشانِ خدنگِ ناز
زان پیشتر کہ سوی من آبی بجنگِ ناز

اُس ابرو کی کماں سے لگے دل پہ پے بہ پے
تیرِ نگاہ، ناوکِ غمزہ، خدنگِ ناز

---

[1] ج : دیکھیو

[2] ن : مجھ کو تو بہرِ سخن اب خامہ وار

یہ دَور میں نہیں نگہ اُس ترک چشم کی در پردہ میزند بدلِ من تفنگِ ناز
آہوئے چشمِ یار نہ ہونے کسی کا رام در گردنش اگر نبود پا لہنگِ ناز
نازِ بتاں اُٹھا نہیں سکنے کا تو بقا
زن بوسہ و بہل کہ گرانست سنگِ ناز

دلا، اُٹھایئے ہر طرح اُس کی چشم کا ناز زمانہ با تو نسازد، تو با زمانہ بساز

ہے تپاں زیرِ زمیں کون جگر چاک ہنوز کہ تزلزل میں رہے ہے کرۂ خاک ہنوز

جو چشم و دل سے چڑھا دوں نالے بہ آب اوّل دوم بہ آتش
تو ماہ و خور کے بھروں پیالے بہ آب اوّل دوم بہ آتش
جو چشم روووے، تو دل بھی آہوں میں میری لختِ جگر پروے
بچے وہ سمرن تری، یہ مالے بہ آب اوّل دوم بہ آتش
جو کوئی تربت پہ میری گزرے، تو تابِ اشک و تبِ فغاں سے
پڑیں دو ہر ہر قدم پہ چھالے بہ آب اوّل دوم بہ آتش
جو آہِ بیچاں سے اشک شب کو فلک پہ گردش کناں چڑھے گا
تو گردِ مہ دو پڑیں گے ہالے بہ آب اوّل دوم بہ آتش
سرشک و آہ اب یہ بے اثر ہیں کہ جا فلک تک شبِ جدائی
دہِ اثر پہ یہ دے ہیں تالے بہ آب اوّل دوم بہ آتش
مباد، فرقت میں چشم و دل کی، یہ اشک ریزی اور آہ خیزی
بلائے ناگہ جہاں پہ ڈالے بہ آب اوّل دوم بہ آتش

فلک سے دیووں کی طرح اُس بن، سرشک آہِ بقا سے اب تو
چڑھے ہیں لڑنے کو دو رسالے بہ آب اوّل دوم بہ آتش

یار سے ہم کو نہ آئی کبھی درپیش غرض — در نہ رکھتے ہیں سبھی شاہ سے درویش غرض
تیرے لگ چلنے سے ڈرتے ہیں ہم اے کژدمِ عشق — عاقبت ہم پہ لگانا ہے تجھے نیش، غرض
بیش و کم پیار کے رمزوں سے یہ معلوم ہوا — یار کچھ ہم سے بھی رکھتا ہے کم و بیش غرض
دل کے لینے ہی تلک یار تھے، بس، ہم نے میاں — تم سا خود کام نہ دیکھا کوئی اور خویش غرض

خوں مری چشم سے ہوتا ہی نہیں بند بقا
ابھی بہتا ہے یہ ناسورِ دلِ ریش غرض

آدیں سمس (کذا) میں جو وہ رخسارِ آتش رنگ و شمع
تو نہ ہوں، ہم سنگِ یکدیگر مگر پاسنگ و شمع

وقتِ شب گیر .... اس کے تھے ہم بھی پئے محل رواں
گوش و چشم اپنے لگائے برصدائے زنگ و شمع

میل تجھ سے سنگ دل کا، گو نہیں میں موم دل
نسبتِ آتش تو باقی ہے میانِ سنگ و شمع

راہ دکھلاتا ہے لیکن آپ چل سکتا نہیں
خضرِ رہ اچھا ہے ناصح پر بہ پائے لنگ و شمع

محتسب بگڑے، تو دیں ہم مست شمع اُس کی جلا
تا رہے مشہور مست و محتسب کی جنگ و شمع

بزم آرائی کرے وہ باغ میں شب کو، تو ہو

نرگسِ مست تری جائے جو تُل بر سرِ گُل
تیغِ ابرو سے گرائے سرِ گُل بر سرِ گُل

موج زن دیکھ ترے حُسن کا دریائے بہار
باندھے بادِ صبا خاک کے پُل بر سرِ گُل

اپنی نازک بدنی سے جو ہو ساقی کو خبر
پھر تو ہرگز نہ پیے بیٹھ کے مُل بر سرِ گُل

کھول کر باغ میں تیرا جُزِ مجموعۂ حُسن
آج لائی ہے صبا آفتِ کُل بر سرِ گُل

گر بقاؔ، ناز سے گویا ہو مرا غنچہ دہن
گردنِ غنچہ گرے شرم سے ڈُھل بر سرِ گُل

گر ترے در پہ نہاں زیرِ زمیں کھویا دل
دیکھیں کیا لاوے ثمر، خاک میں اب بویا دل

کون سا آئنہ رو اُس سے مقابل ہی کہ اب
مثلِ طوطی ہی کے رہتا ہے مرا گویا دل

ضعفِ پیری سے بقاؔ راہ کا کٹنا معلوم
قدمِ خفتہ نہ جاگا تھا کہ اب سویا دل

نہ دبے لب کی جو تقریر تلے شیشۂ مُل
لے بہ اندازِ نگہ تیر تلے شیشۂ مُل

آج شب اتنی پلا مے، کہ بہک کر ساقی
لب پہ لوں شمع کو، گلگیر تلے شیشۂ مُل

.... مے مجھے ایسے سے نہ دے پیرِ مغاں
.... مے ناب کی تاثیر تلے شیشۂ مل

تیرے دیوانے کو ہاں ہاں ہوں .....
کہ مبادا ہلے زنجیر تلے شیشۂ مل

تیری آنکھوں کے تو بیمار ادب سے ساقی
وقتِ قاروره نہ لیں گیر تلے شیشۂ مل

طفلِ قاضی سے ہو ہم چشم، تو غالب ہے کہ لے
موجِ مے درّۂ تعزیر تلے شیشۂ مل

یوں مے اُس چشم سے بہکے ہے کہ ——
——اُس کی ہو تصویر تلے شیشۂ مل

گردن و سینہ ہے یوں اُس ——
جیسے ڈھانکے کوئی زنجیر تلے شیشۂ مل

میرے گھر چل تو وہی تجھ کو پلاؤں زاہد
نکلے حدّت سے جو مے چیر تلے شیشۂ مل

باسرود و نالہ تھا شب کو دلِ سوزاں مرا
بزمِ عشرت میں تری، غیرت فزائے چنگ و شمع
شمع رو دنیا کے، عاشق ہیں قبائے تنگ پر
کچھ بھی نسبت ہے بھلا یارو، قبائے تنگ و شمع
وہ چراغِ دیر گر روشن کرے شمعِ حرم
نسبتِ طور و تجلّی دے میانِ سنگ و شمع
..... بقاؔ
رہ نمائے شب ہے کافی ایک پیش آہنگ و شمع

گُل کو ہے بلبل سے مگر قصدِ جنگ
غنچے کے ترکش میں بھرے ہیں خدنگ

لاف زنی حُسن کی کر یار سے
غنچہ صفت مجھ کو نہ لائے بتنگ

بارِ الٰہا، کہیں جا وے نگل
یونسِ نسریں کو خزاں کا نہنگ

آتشِ رخ سے تری اے شمع رو
جل گئے ہم سے کئی ہو کر پتنگ

دل پہ مرے عشق ہے اب پنجہ زن
دیکھ بقاؔ کُشتیِ بازو کلنگ

ساتھ غیروں کے جو دیکھا تجھ کو پیتے ہل کے مُل
صبر کے دریا کا توڑا چشمِ تر نے پل کے پُل

حاجتِ سیرِ چمن پھر کیا ہے، جب وقتِ خرام
ہوں شگفتہ تیرے ہر نقشِ قدم سے گل کے گُل

دل کو لائق ہے بہ رنگِ شانہ اُن زلفوں سے شغل
وہ خمِ گیسو نہ ہوں گو گردنِ شاغل کے غُل

ہاتھ کا تیرے فلک، ہر چند ناخن ہو ہلال
تو بھی کھُلنے کے نہیں عقدے مری مشکل کے کُل

کر چکی تھی جوہر آئینے کا وہ تیغِ نگاہ
گر نہ آجاتا بقاؔ عکس آگے اُس قاتل کے تُل

بسکہ خونخوار ہے، رکھتا ہے ملا کر صیاد
دہنِ زخم سے نخچیر تلے شیشۂ مل

کشتہ کرنے کو ہے مس غم کی یہ آتش کے عوض
جام کے بوتۂ اکسیر تلے شیشۂ مل

ہم بقا رند ہیں، گر ہو دیں مریدِ زاہد
تو رکھیں توڑ کے اس پیر تلے شیشۂ مل

کر کے با تابِ نگہ یاں تن و آتش کو بہم
ربط مژگاں سے نہ دے دامن و آتش کو بہم

مجھ سے کچھ ربط نہ تھا تجھ کو، مگر شکلِ چراغ
عشق نے جمع کیا روغن و آتش کو بہم

اشک آنکھوں کو فغاں لب کو، سخن لو بہلا (کذا)
کیونکے اس دل میں رکھوں خرمن و آتش کو بہم

دانہ اُڑ جاوے چٹک تن سے، جو یوں سینے میں
اس تپِ دل سے رکھوں خرمن و آتش کو بہم

آتشِ دل سے ہوئی گرم وہ پیکاں، اے چشم
اشک سے سرد کر اس آہن و آتش کو بہم

گرمِ جولاں یہ ہوا آہ کہ ہم چھو نہ سکے
ایک سایا کے ترے توسن و آتش کو بہم

محوِ موسیٰ نے کیا طور کا وہ جلوۂ نور
تجھ سے پا دل میں مرے ایمن و آتش کو بہم

بن چکا بس یہ اِدھر، اور اُدھر آہوں سے جلا
لاگ ہے کچھ مرے اِس مسکن و آتش کو بہم

شمع ساں سر سے لگی یوں کہ کٹایا جب سر
تو رہا ربط مری گردن و آتش کو بہم

رخِ افروختہ اپنا نہ سمجھ ثانیِ شمع
کیا تناسب ہے رخِ روشن و آتش کو بہم

کیوں زباں سے نہ جلا دے تری چھاتی کو رقیب
حکمِ واحد ہے بقا دشمن و آتش کو بہم

اُس لب سے رشؔ[1] نہ چوسے قدح اور قدح سے ہم
تو کیوں ملے[2] سبو سے قدح اور قدح سے ہم

---

[1] i : کچھ نہ چوسے [2] z : ٹلے

ساقی نہ ہووے پاس، تو کب جُرعۂ شراب — شیشے کے لے گلو سے قدح، اور قدح سے ہم
باقی رہے نہ بادہ، تو اُس کے عوض میں آب — لے خُم کی شست و شو سے قدح اور قدح سے ہم
گردش پہ تیری چشم کی بحث ہے ہم سے یار (ق) دعوے کی گفتگو سے قدح اور قدح سے ہم
چشم اپنی ٹک دکھا دے اُسے تو کہ آوے باز — اس بحثِ دو بدو سے قدح اور قدح سے ہم
بوسہ ترے دہن سے بہ ہنگامِ مے کشی — لے ہے کس آرزو سے قدح اور قدح سے ہم

پاتے ہیں میکدے میں بقا نعمتِ[1] شراب
خم سے سبو، سبو سے قدح اور قدح سے ہم

یار کے نقشِ آستاں ہیں ہم — مٹ گئے جب، تو پھر کہاں ہیں ہم
تیغ رانی ادھر بھی اے صیّاد — کیا ہوا صید ناتواں ہیں ہم
شمع ساں اشک و آہ سے اپنے — آب و آتش کے درمیاں ہیں ہم
شبِ فرقت میں یار کی ہر چند (ق) درپے نالہ و فغاں ہیں ہم
نالۂ بے اثر یہ کہتے[2] ہیں — مرغِ گم کردہ آشیاں ہیں ہم
اے[3] بقا وقتِ نزع ہے، مل لیں
جب مندی آنکھ، پھر کہاں ہیں ہم

کیونکر بھلا رواں نہ رہے میری جوے چشم — ہے اشک سے مدام جواب آبروے چشم
اُس خاکِ آستاں کو کریں سرمۂ بصر — اے مردماں! یہی ہے مری آرزوے چشم
حیراں ہے تب سے غنچۂ نرگس، بصد زباں — جب سے سنی ہے یار تری گفتگوے چشم

---

[1] ز : روزِ فیضِ مے [2] ن، : یہ کہتا ہے [3] ج : آبقا

تڑپے بہت، پہ جانبِ صیّاد آخرش
قلّابِ عشق کی کششیں ہم کو لائیاں

تب[1] صورتیں جو پیشِ نظر تھیں، سو مثلِ اشک
یوں گم ہوئیں زمیں میں کہ ڈھونڈھے نہ پائیاں

پاکر شفا بنفشۂ خط سے وہ انکھڑیاں
صحّت کے دن بھی خون سے میرے نہائیاں

مانا نہ ترکِ چشم نے، آخر کیا ہی قتل
ہر چند دل نے دیں ترے لب کی دہائیاں

دیکھیں بقاؔ کہ ہجر کے آئے پہ کیا بنے
اپنے تو ہوش اُڑ گئے سن سن ادائیاں

قابلِ شکوہ یہ اپنی ہی زباں ہے، کہ نہیں
گلۂ جور ترا، ورنہ کہاں ہے کہ نہیں

معجزِ حُسن تمھارے سے، بھلا کوہِ سریں
موسے آویختہ، اے موکمراں ہے کہ نہیں

ٹک تو اندازِ تبسم بھی کہ اے غنچہ دہن
کوئی کیا جانے گا تنگی سے، دہاں ہے کہ نہیں

یہ معیّن ہے کہ نکلے گا وہیں اس کا سُراغ
ورنہ اپنا دلِ آوارہ کہاں ہے کہ نہیں

زلف میں اُس کی، صبا! سلسلہ جنباں ہو کر
جا کے آواز تو دیجو، کوئی یاں ہے کہ نہیں

ہے یقیں یہ[2] تو مجھے ذبح کرے گا قاتل
پر کوئی دم کے لیے جی کی اماں ہے کہ نہیں

امتحاں حسرتِ دیدار کا کرنا[3] ہے تو پھر
دیکھیو، دیدۂ بسمل نگراں ہے کہ نہیں

یہ مرا رختہ، رشکِ غزلِ سوداؔ ہے
لیکن اُس پہ بھی بقاؔ کو یہ گماں ہے کہ نہیں

بس مجھی کو نظر آتا ہے یہ یوں بے حرم (کذا)
تم بھی ٹک دیکھیو صاحب نظراں، ہے کہ نہیں

---

[1] ہ : وہ
[2] مج : پھر تو مجھے
[3] مج : امتحاں حسرتِ دیدار جو کرتا ہے تو پھر

کیا جانے کس کے ہوں گے یہ گیسو و بالِ دل　　کس صاحبِ نظر کا یہ خط ہوگا موئے چشم
نرگس کی طرح یہ بھی مبادا مریض ہو　　آئینہ بار بار نہ رکھ روبہ روئے چشم
سرمے سے اُس کی چشم ہے گویا، مگر بقاؔ
مقدورِ سرمہ نیست کہ بندد گلوئے چشم

یکساں لگیں ہیں اُن کو تو دیر و حرم بہم　　جو پوجتے ہیں دل میں خدا و صنم بہم
دیکھا تو ایک شعلے سے اے شیخ و برہمن　　روشن ہیں شمعِ دیر و چراغِ حرم بہم
باریک بیں دہن سے ترے وقتِ خندہ یار　　کرتے ہیں دیدۂ ہستی و سیرِ عدم بہم
ناصح! بہم تری، نہ ہماری سُنے گا تو　　کیا فائدہ جو بحث کریں دو اصم بہم
خرمستیوں پہ محتسب آتا ہے، چل بقاؔ
باندھیں ہم اس حمار کے دونوں قدم بہم

مے چُرا، زاہد مجھے کہتا ہے، مے بھر دیں گے ہم
بھیجو مسجد میں اُٹھا اک شیشہ لا دھر دیں گے ہم

جب میرے دل جگر کی طلسمیں بنائیاں　　بر ریزِ آبِ اشک کیں آنکھوں کی کھائیاں
دستِ حنا سے پھوٹ بہا آخرش کو خوں　　کیں پنجہ کر کے تجھ سے جو زور آزمائیاں
اُس آنکھ سے جب آنکھ ملائی، تو بحر نے　　چشمِ صدف میں موج کی پھیریں سلائیاں
کس فتنۂ زمیں سے یہ رہتا ہے شب دوچار　　اُڑتیں ہیں آسماں کے جو مُنہ پر ہوائیاں
اُس شمع رُو نے، اپنے شہیدوں کی، جوں پتنگ　　گڑنے نہ دیں زمین میں لاشیں، جلائیاں
اس قندلب کی دید سے، اِن پتلیوں کو، مور　　کھاویں گے زیرِ خاک، سمجھ کر خطائیاں

سیلاب[1] سے آنکھوں کے رہتی ہے خرابے میں
نگری جو مرے دل کی بستی ہے دو آبے میں

اِس چشم کے ساغر میں، اے ساقیِ غم بھر دے
ہے کچھ مئے خوں باقی گر دل کے قرابے میں

ہر صبح ترے در پر، کس جرم سے لاتے ہیں
خورشید[2] کو بٹھلا کر گردوں کے ارابے میں

پتلی مری دیکھ اس کو، یوں دل کو جلاتی ہے
ماہی کو کریں بریاں جس طرح سے تابے میں

مت قتلِ مغاں کر کر، میخانہ کرو ویراں
اے چشمِ بتاں حاصل اِس خون خرابے میں

اب فکرِ بقا تیری رکھتی ہے جو چالاکی
سو چال نہ دیکھی میں مرکب زور رکابے میں

جو جہاں کے آئنہ ہیں دل انھوں کے سادہ ہیں
دل میں جا دینے کو وہ ہر ایک کے آمادہ ہیں

قتل سے عاشق کے تو نے اب تو کھائی ہے قسم
آخر اے قاتل یہ باتیں پیش پا افتادہ ہیں

کل کے دن جو گردِ مے خانے کے پھرتے تھے خراب
آج مسجد میں جو دیکھا، صاحبِ سجّادہ ہیں

بند میں مطلق[3] جو مجھ کو خطرۂ صیاد ہو
ہوں اسیرِ دام، پر وضعیں مری آزادہ ہیں

راہ پیمایانِ اقلیمِ عدم سے یادگار
دامنِ صحرا میں اب باقی نقوشِ جادہ ہیں

چشمِ ساقی کی لیے ہیں تیغِ ابرو دوش پہ
لگ نہ چل ان سے بقاؔ، یہ ترک مستِ بادہ ہیں

کیوں نہ مرغِ چمن اُس کا ہو نثارِ دامن
ہیں رگِ گل سے مرے یار کے تارِ دامن

---

[1] ن : سیلاب سے آنکھوں کے رہتے ہیں خرابے میں ٹکڑے جو مرے دل کے بستے ہیں دو آبے میں

[2] مج : ہے کندہ خطِ باطل مسجد کے کتابے میں

[3] مج : اصلا۔

K. UNIVERSITY

تو ہے گل پیرہن، اور ہم ہیں غبارِ دامن
جی دھڑکتا ہے نہ ہووے ترے بارِ دامن

اشک نے چشم کے دریا میں جو کی طغیانی
آ لگی موجِ گہر تا بہ کنارِ دامن

گھیر دامن کا ترے دامنِ زیں پر دیکھا
کھب گئی چشم میں دامن سے بہارِ دامن

مردہ مت جانیو بلبل کو چمن میں گلچیں
مشتِ پر ہونے کو بس ہیں ترے خارِ دامن[1]

جو مری آہ سے واقف ہیں سو وہ گردوں کا
شفقِ شام کو سمجھیں[2] ہیں شرارِ دامن

چاک سے دستِ جنوں کے تو نہ دیکھا ہرگز
ایک حالت پہ بقاؔ اپنا قرارِ دامن

تجھ سیہ چشم سے امیدِ وفا جو رکھیں
چاہیے اشک سے پہلے ہی وہ منہ دھو رکھیں

چشم گویا ہے بتوں کی، یہ عجب معجز ہے
سرمہ بھی دیویں اور آنکھوں کو سخن گو رکھیں

قتل سے کیوں ہیں ڈروں، بات یہ کتنی ہے رقیب
گرچہ اک تیغ کی جا موکماں دو رکھیں

یار آخر ادھر آوے گا، بھلا بہرِ نثار
صدفِ چشم سے ہم کچھ تو گہر رو رکھیں

بوسۂ لب سے دوا بھی ہو کچھ اس کے ہمراہ
دیں بتاں درد، تو یوں دیویں نہیں تو رکھیں

ہو رہے گا یہ کبھی ابرِ مژہ سے سرسبز
مزرعِ دل میں تو ہم تخمِ امل بو رکھیں

مفت بر کتنے ہیں یہ شوخ، بقاؔ میں جو کہا
دل کو رکھتے ہو، لگے کہنے کہ لا تو رکھیں

ساقی کو[3] دو نوید، بہار آئی باغ میں
سودے نے پھر کیا[4] ہے خلل سا دماغ میں

---

[1] مج: تارِ دامن
[2] مج: شفقِ شام سمجھتے ہیں
[3] ک: ساقی کو پھر نوید
[4] گ، ش، ک: پھر خلل سا کیا ہے

بلبل کے اشکِ سرخ کی پروا ہے کب اُسے
بو گُل کی باغباں کے بھری ہے دماغ میں

رکھتا نہیں ہے سوزِ محبت اگر پتنگ
ہر لحظہ کیوں گرے ہے وہ آکر چراغ میں

انصاف دشمن ایک مرا یار ہے تو ہو
جو فرق جانتا نہیں طوطی و زاغ میں

دل کی سی اپنی کہیو تو اے گل کہ کیا ہے فرق
دستانِ عندلیب و صدائے کلاغ میں

ساقی بغیر مے کے بدل، اب چمن کے بیچ
جوں لالہ خونِ دل ہے ہمارے ایاغ میں

اب تو قبول قیدِ محبت کا نام ہے
کب کب بقاؔ شگفتہ تھا حالِ فراغ میں

راستی پر ہم سے کس دن آئیاں
یار کی زلفیں جو ہیں بل کھائیاں

مرحبا، رو رو کے اے ابرِ مژہ
روز ساون کی رُتیں دکھلائیاں

سنگ مارا سر سے اور سر سنگ سے
سرنوشتیں جب مری دکھلائیاں

باغ میں اے ساقیِ غنچہ دہن
جب سے کیں ہیں تو نے زلف آرائیاں

غنچۂ ہر گل ہے خمیازے کے بیچ
تاک لیتا ہے پڑا انگڑائیاں

جل کے خاکستر ہوا غم سے بقاؔ
اے میاں! اتنی بھی بے پروائیاں

آہیں افلاک میں مل جاتی ہیں
محنتیں خاک میں مل جاتی ہیں

صورتیں آبلہ ہائے دل کی
خوشۂ تاک میں مل جاتی ہیں

صیدِ بسمل کی نگاہیں صیاد
تیرے فتراک میں مل جاتی ہیں

نگہیں یار کی جوں تارِ رفو
جگرِ چاک میں مل جاتی ہیں

پوپلے زاہدوں کی، کھاتے وقت
ٹھوڑیاں ناک میں مل جاتی ہیں

تھلکیاں دل کی بقاؔ دیکھوں گی (کذا)
زخم کا واک میں مل جاتی ہیں

غیرتِ گل ہے تو، اور چاک گریباں ہم ہیں
رشکِ سنبل ہے تری زلف، پریشاں ہم ہیں

ناتواں چشم تری، ہم ہیں عصا کے محتاج
نت کی بیمار وہ، اور طالبِ درماں ہم ہیں

رشکِ طوطی ہے خطِ سبز ترا، ہم گویا
دونوں عارض ہیں ترے آئنہ حیراں ہم ہیں

آج کل ہائے ترے ناز کے ہاتھوں اے یار
صدمہ پہنچے ہے ترے قلب کو، نالاں ہم ہیں

لالہ رویوں کی محبّت میں اب اے سروِ سہی
سر بسر داغ تو اور سروِ خراماں ہم ہیں

ہم اسیرِ خمِ مو تیرے، ہمارا تو رام
خاتمِ جم ہے ترے پاس، سلیماں ہم ہیں

تو سخن سنج بقاؔ، نام ہمارا مشہور
خاتمِ جم ہے ترے پاس، سلیماں ہم ہیں

بلبل[1] سے کہا گل نے، کر ترک ملاقاتیں
غنچے نے گرہ باندھیں جو گل نے کہیں باتیں

یہ گل اندام جو صرفے سے تک اک ناز کریں
کام لیں زلف سے، کاکل کو پس انداز کریں

دکھا کے طولِ شبِ جدائی، خدا نے ڈالا ہمیں قفس میں
ابھی تو شب ہے، سحر کہاں کی، سحر جواب ہو تو سو برس میں

عشق[2] نے منصب لکھے جس دن مری تقدیر میں
داغ کی نقدی ملی، صحرا ملا جاگیر میں

---

[1] س: بلبل نے کہا گل سے
[2] ن

دیکھیے[۱] نصبِ مجنوں پہ یہ لیلیٰ صفتاں خاک میں ہم کو ملا، کس کو سرافراز کریں

اُس[۲] بزم میں پوچھے نہ کوئی مجھ سے کہ کیا ہوں جو شیشہ گرے سنگ پہ میں اُس کی صدا ہوں
اے عشق! تو ہر چند مرادشمنِ جاں ہو مرنے کا نہیں، نام کا میں اپنے بقا ہوں

دیکھ[۳] آئینہ جو کہتا ہے کہ اللہ رے میں! اس کا میں دیکھنے والا ہوں بقا، واہ رے میں

صاف[۴] تر شیشۂ دل سے ہے ہر اک اس کا حباب
مے بھی کرتی ہے عجب جلوہ گری شیشے میں
گرمیِ مے سے پڑے آبلے یوں دل میں بقا
جس طرح ہوویں حبابِ جگری شیشے میں

ہم سا کوئی میخوار گر اس بزم سے گم ہو ہو خاک، عجب کیا ہے جو خشتِ سرِ خم ہو
بیدار نہ ہو کشتہ ترا خوابِ عدم سے سرزد بھی مسیحا سے اگر نعرۂ دم ہو
زر، مایۂ ادبار ہے عالم میں، وگرنہ طاؤس کا کب نقشِ درم، آفتِ دم ہو
تحقیق، کہ اس سخت زمیں پر ہو دوپارہ
گو توسنِ خامہ کا، بقا، آہنی سم ہو

مجھ سے کب تک اس دلِ صد چاک کا پیوند ہو اب یہ دیوانہ، الٰہی! خاک کا پیوند ہو

---

۱ م ۲ ہ ۳ ہ ۴ شع۔

میں ہوں میخوارِ اِس چمن کا، میرا[1] ہر ایک استخواں
بعدِ مرگ، اے کاش نخلِ تاک کا پیوند ہو

صید ہونے سے ہمیں اپنے یہ مطلب ہے کہ پوست
ہو جدا تن سے، ترے فتراک کا پیوند ہو

خشک ہو، زاہد! تری تاثیرِ زہدِ خشک سے
اب جو طوبیٰ میں تری مسواک کا پیوند ہو

ہے[2] بقا ہر جا شگافِ اِن میں، مگر یہ بختِ دل
زخمہائے دیدۂ نم ناک کا پیوند ہو

نہ ہے زخمِ دلِ نازک پہ حکمِ بخیۂ مژگاں کو
کرے کب سوزنِ عیسیٰ رفو گُل کے گریباں کو

نہ ہو[3] جاں بر تری بیمار آنکھوں کا، دمِ آخر
چُرا دے خضر بھی گر مُنہ میں اُس کے آبِ حیواں کو

کہو ایسی لگاوے تا دمِ شمشیرِ قاتل بر
تبسم زیرِ لب پنہاں نہ ہو زخمِ نمایاں کو (کذا)

نہ ہوں تا یوسفِ دل غرق اس میں حسن سے تیرے
کیا ہے سرنگوں اعجاز سے چاہِ زنخداں کو

بہ رنگِ گرد باد آوارگی میں گرم ہوں اتنا
اُڑیں اخگر، اگر جھاڑوں غبار آلودہ داماں کو

کمانداران ابرو کب کریں ہم کو ہدف اپنا
بجھا کر زہر میں جب تک نہ دے لیں آبِ پیکاں کو

بقا! وہ نالۂ پُر پیچ و تاب اپنی ہوا صرصر
کہ جس نے چرخ پر رکھا سدا اِس چرخِ گرداں کو

کس لیے اے شمع رو! پھر وہ ترا پروانہ ہو
جو جلے پروانہ وار، اور تجھ کو کچھ پروا نہ ہو

کیا کریں آزاد ہو بندِ قفس سے ہم اسیر
رشتۂ اُلفت سے گر صیاد کے، پر، وا نہ ہو

ہم سے، یا اغیار سے ہو تجھ کو ابرو پر گرہ
ہے تذبذب، جب تلک یہ عقدہ ہم پر وا نہ ہو

---

[1] ج : پھر مرا ہر استخواں۔ [2] ج : ہیں۔

[3] ن : نہ ہووے حلق تر بیمار کا تیرے دمِ آخر۔

جلوہ گر ہے یار اور سوتا ہے یوں غافل رقیب
کیا گنہ خورشید کا، گر چشمِ شپّر دانہ ہو

اب بقاؔ، ایسی پڑی غم کی گرہ دل میں کہ یار
ناخنِ ابرو سے اُس کو وا کرے، پر دانہ ہو

جو گریۂ مدام کی آنکھوں کو خو نہ ہو
محفل میں دل جلوں کی مجھے آبرو نہ ہو

ہرگز نمازِ عشق کی نیّت نہیں درست
جب تک کہ تازہ خونِ جگر سے وضو نہ ہو

قانع ہوں رنگِ زرد پہ اپنے، وگرنہ یاں
ہے کون وہ کہ زر کی جسے جست و جو نہ ہو

رخ اس کا دیکھ، آب جو ہو جائے آئنہ
خجلت سے پھر دوبارہ کبھی رو بہ رو نہ ہو

مژگاں کو ساتھ لے نہ گریں اشک کیوں بقاؔ
کس کام کا وہ دُرِّ نجف جس میں مو نہ ہو

قتلِ عشّاق کرو، تم سے تو ہاں یہ بھی ہو
سر سے موجود ہیں ہم، کاش میاں یہ بھی ہو

یار بگڑے، تو نہیں کینِ رقیباں سے خطر
ظلم لاکھوں ہیں جہاں، ایک وہاں یہ بھی ہو

بے وفائی کا تو کیا ذکر ہے یاں غیرِ وفا
یہ تعجب نہیں گر تم کو گماں یہ بھی ہو

خُلطۂ غیر میں تو مجھ سے اشارات نہ چھوڑ
ہے ظاہر میں تو وہ چال، نہاں یہ بھی ہو

تیر اوروں پہ لگاتے ہو، کوئی ادھر بھی
ہیں جہاں لاکھ ہدف، ایک نشاں یہ بھی ہو

راہ تکتا ہے مرا لختِ جگر آنسو[1] کی
گر وہ چل نکلے، تو پیچھے سے رواں یہ بھی ہو

اب تو میں دوست کو دیتا ہوں جگہ پہلو میں
گو مرے دل کی طرح دشمنِ جاں یہ بھی ہو

جا کے واں، حال مرا بھول نہ جانا ہمدم
عرضِ احوال میں آج اپنے، بیاں یہ بھی ہو

---

[1] س : آنکھوں کی

طلبِ غیر کے دم اُس نے بقاؔ کو نہ کہا
کہ مری بزم میں حاضر ہو فلاں، یہ بھی ہو

سرو کی لافِ بلندی کس سند پر راست ہو
سرکشی کا جامہ جب تیرے ہی قد پر راست ہو

خاک بستر، خشت بالیں، بس ہی ہم کو دہر میں
شیخ! تو کعبے میں سو، فرشِ نمد پر راست ہو

تہِ خم کیا دیتا پشتِ آہ کو دل میں شکست
جب وہ آپھی دیدۂ تر کی مدد پر راست ہو

بندہ ہو قد کا ترے پاسِ ادب سے ہے کھڑا
سروِ آزادِ چمن اب اپنی حد پر راست ہو

چشمِ کج بیں میں نہ ہو جا گو کہ اُس شمشاد کو
وہ کشش قد کی کب ایسے فردرد پر راست ہو

کیوں نہ اس اک حد سے روشن ہوں سب در از خلق (کذا)
حَمل جب واحد کا کرنا ہر عدد پر راست ہو

سن بقاؔ یہ ریختہ اب شاعرانِ کج نہاد
کیوں نہ بیٹھیں مسندِ بغض و حسد پر راست ہو

میری گو آہ سے جنگل نہ جلے، خشک تو ہو
اشک کی تفت سے گو جل نہ جلے، خشک تو ہو

پاک کرتے ہوئے گر اشک مرے دامن کا
نالۂ گرم سے آنچل نہ جلے، خشک تو ہو

نمیِ اشک کے باعث جو مری آہ سے رات
زیرِ رخ تکیۂ مخمل نہ جلے، خشک تو ہو

مہ وشا! حسن کی گرمی سے ترے وقتِ عرق
تن پہ گر نیمۂ ململ نہ جلے، خشک تو ہو

ساقیا موسمِ گل بے مے و مینا، جو مری
آہ کی برق سے بادل نہ جلے، خشک تو ہو

شعلہ رونت کی سواری میں سبب گرمی کے
زیرِ راں گو ترے کوتل نہ جلے، خشک تو ہو

ہو اگر یہ دلِ سوزاں ترے قلیاں کی چلم
آب نے سے جو یہ نرسل نہ جلے، خشک تو ہو

ہائے اے آتشِ دل اب سے گرمی سے جلا (؟)
چشمِ تر کی مری چھاگل نہ جلے، خشک تو ہو

طفلِ بد خو ہے مرا اشک، خدایا اس کی
گو بہ خرمن ہوئی کونپل نہ جلے، خشک تو ہو

غرق ہے اشک میں گھر تجھ سے اب اے نالۂ گرم
گو مرے سُکھ کا یہ منڈل نہ جلے، خشک تو ہو

اشک سے خامہ رہے جو مرے بس میں نہ بقا
گو تب تن سے یہ ببل نہ جلے، خشک تو ہو (کذا)

کس[۱] نے چمن میں رنجہ کیا عندلیب کو
غنچے رہے ہیں دانتوں میں دبا اپنی جیب کو

تو نے اس طرح سے اے چرخ گرایا ہم کو
کہ موئے پر بھی کسی نے نہ اُٹھایا ہم کو

شب[۲] گزری، اب اے سحر کے نالو
پھر چرخ پہ برچھیاں سنبھالو

گر قتل کیا بتا کو خوباں
اس بات کو مُنہ سے مت نکالو

پنہاں ہی بھلا ہے خونِ عاشق
جانے دو اب اس پہ خاک ڈالو

صاف جی کر کے ملا تجھ سے ہزار آئینہ
ہے ولیکن مری خاطر کا غبار آئینہ

رخ مرے یار کا دیکھے، تو کسی صورت میں
سادہ رو اپنے تئیں دے نہ قرار آئینہ

زلف گرد رُخ سے اُٹھا کر وہ کرے تجھ پہ نگاہ
روزِ روشن ہو، یہ تیری شبِ تار آئینہ

مت حباب اس کو سمجھیو، کہ سدا رکھتا ہے
تیرے ہاتھوں سے دلِ آبلہ دار آئینہ

تو وہ خود بیں ہے مری جاں، کہ ہر اک آن کے بیچ
دیکھ لیتا ہے اُٹھا کر دو سہ بار آئینہ

اِس زمیں میں غزل اک اور کہوں شستہ و صاف
جس پہ سو جان سے ہو جاوے نثار آئینہ

۱؎ ز۔ ۲؎ ہ۔

خوبرو جو ہیں، اُنھیں پشت دے یار آئینہ
جس گھڑی ہو ترے مکھڑے سے دوچار آئینہ

کیوں نہ حیران رہے باغ میں بلبل، جس کو
چہرۂ گل سے دکھاتی ہے بہار آئینہ

صحبتِ زلف و رخِ یار میسّر ہے تجھے
خوش گزرتی ہے تری لیل و نہار آئینہ

میں ہوں اے دل اِسی حیرت میں کہ کس صورت سے
صحبت اُس یار سے کرتا ہے برآر آئینہ

گہ تو چھب دیکھے ہی، گہ چہرہ، ترے ہاتھوں سے
ایک جاگہ نہیں رکھتا ہے قرار آئینہ

دور کر خط کو، جو باقی ہے چہرے کی صفا
ہے یہ بہتر کہ ہو بے نقش و نگار آئینہ

شعر صاف ایسے ہی کہ اور بقاؔ طورِ غزل
جیسے زجّاجِ حلب کرتے ہیں یار آئینہ

رشکِ گلشن ہے ترے عکس سے یار آئینہ
تو یہ سمجھے ہے کہ ہے باغ و بہار آئینہ

ڈرتے آتے ہیں ترے تیرِ نگہ سے مردم
یا زرہ پوش ہو، یا باندھ کے چار آئینہ

میری آہوں نے کیا تیرے دلِ سخت کو آب
بارے، یہ سنگ ہوا آخرِ کار آئینہ

اشک فی الفور بھر آویں گے تری آنکھوں میں
بھر نظر دیکھیو مت صورتِ یار آئینہ

کیوں نہ منصور کہوں اُس کو کہ نت رہتا ہے
عکسِ مژگاں سے ترے، بر سرِ دار آئینہ

دعویِ تیز دوی کل تئیں کرتی تھی صبا
آج بازی ترے گلگوں سے وہ ہار آئی نہ

اک غزل اور پڑھ ایسی کہ بقاؔ محفل میں
حیرت اشخاص سے کر دیوے دوچار آئینہ

چشمِ مست اُس کی سے ہے اب تو دوچار آئینہ
آخر اِن باتوں کا کھینچے گا خمار آئینہ

تجھ[1] کو کرتا ہے، ترا عکس دکھا کر، بے تاب
اب تو پردے ہی میں کھیلے ہے شکار آئینہ

---

[1] ج : مجکو

حیرتِ حسن نے اُس شوخ کی، مارا ہے جسے
اُس کا لازم ہے کریں لوحِ مزار آئینہ

گر اسی طرح کرے کشتۂ حیرت اپنا (ق)
دم بہ دم مجھ کو دکھا کر رُخِ یار آئینہ

پس یقیں ہے کہ ملک نامۂ اعمال کی جا
لا مرے ہاتھ میں دیں روزِ شمار آئینہ

گر یہی اشک فشانی ہے، تو ہم آنکھوں سے
کر دکھا دیں گے تجھے جیب و کنار آئینہ

مت اسے چار غزل کہہ، کہ صفائی سے بقا[1]
جسم پر ہے یلِ معنی کے یہ چار آئینہ[2]

چھپ کے نظروں سے، اِن آنکھوں کی فراموش کی راہ
اب جو آتا ہے کبھی دل میں تو وہ گوش کی راہ

آگے، جوں اشک وہ رہتا تھا سدا پہلو میں
کیوں اب اُس طفل نے گُم کی مری آغوش کی راہ

کیونکے پونچھے گا وہ آکر مرے آنسو ہیہات
کوچے سب اشک سے گِل ہیں، نہیں پاپوش کی راہ

بھر سفر نام جپوں گا ترا، تو راہ کٹے
یوں تو طے ہو گی نہ اس رہ روِ خاموش کی راہ

چھوڑ کر کوچۂ میخانہ، طرف مسجد کے
میں تو دیوانہ نہیں ہوں جو چلوں ہوش کی راہ

یوں تو آتا نہیں، اے کاش مرے گھر کوئی
پھیرے نشّے میں غلط اس بتِ مے نوش کی راہ

---

[1] مج: کہ صفا سے یہ بقا۔

[2] مج: جسم اوپر یلِ معنی کے ہے چار آئینہ۔

ڈس گئیں ہائے مرے دل کے تئیں آج بقا
ناگنیں زلف کی اُس سر سے اُتر، دوش کی راہ

چشمِ تر جام، دلِ بادہ کشاں ہے شیشہ
محتسب آج کدھر جام، کہاں ہے شیشہ

بزمِ ساقی میں جو آواز نہیں قلقل کی
اِس قدر آج یہ کیوں پنبہ دہاں ہے شیشہ

محتسب سنگ لیے ہاتھ میں اور سوے فلک
دم بہ دم چشمِ دہن سے نگراں ہے شیشہ

پانو رکھتا ہی نہیں ناز سے بالائے زمیں
کف بہ کف بزم میں ساقی کی رواں ہے شیشہ

ہے تراوش میں بقا اِس[1] سے مئے ناب سخن
ہے بجا کہیے اگر، اپنا دہاں ہے شیشہ

پیوند[2] ہوا ایسا رخ سے خطِ جانانہ
تھا یارِ چمن گویا یہ سبزۂ بیگانہ

آئے جو مرے گھر تم، کی راہ غلط کیدھر
بے وجہ نہیں پیارے بھولے ہو رہِ خانہ

اے محتسبِ ناداں جوں تاک نہ اَینڈ اتنا
کھا جائے گا کیا مجھ کو، انگور ہوں بیدانہ

ہر روز جو اے گل رو، بلبل ہوں، تو پھر ہر شب
ہوتا ہوں فدا تجھ پر جوں شمع بہ پروانہ

پیتا ہوں جگر کا خوں میں تو بہ شکن، زاہد
اس بزم میں بے ساقی پیمان ہے پیمانہ

اُس زلف میں ہر لحظہ چھیڑا اس دلِ خونیں کو
کرتا ہے حنا بندی انگشت میں اب شانہ

دیوے جو بقا بوسہ وہ شوخ دمِ آخر
تو آبِ بقا سے ہو پُر عمر کا پیمانہ

---

[1] ج : اپنی۔

[2] ن : پیوند ہوا رخ سے ایسا۔

ہر لختِ دل آنکھوں میں مژگاں سے ہے پیوستہ
اس ابرِ بہاری سے ہر خار ہے گلدستہ
ان سنگدلوں کے اب ہاتھوں سے بچوں کیونکر
میں باغِ محبت میں ہوں بلبلِ پر بستہ

ازبس ہوں بقاؔ شائق اُس مطلعِ ابرو کا
آہِ سحری میری، ہے مطلعِ برجستہ

جب سے خاتم ہے تری زیرِ نگینِ آئنہ
روکشِ ملکِ سلیماں ہے زمینِ آئنہ
چڑھ کے تُنہ پر تیرے، یہ خجلت سے رویا ہے کہ یار
ہے پُر از اشکِ ندامت آستینِ آئنہ
صید کرنے کو مرے صیّاد کے کچھ ان دنوں
عکس نے بے وجہ پکڑی ہے کمینِ آئنہ
دل کو ظاہر بیں کے کب آوے کسی پر اعتقاد
صورتِ نادیدہ کیا ہو دل نشینِ آئنہ
سر نوشت اخفا ہی بہتر، ورنہ کو روسد نی (کذا)
گر عیاں جوہر سے ہو خطِّ جبینِ آئنہ
صاف دل سمجھے ہیں الٹی قدرِ ہر پست و بلند
گر زمیں گردوں ہے تو گردوں زمینِ آئنہ
پا رکابِ عشق میں رکھ تو وہ ہو بیٹھا سوار
توسنِ حیرت جو پایا زیرِ زینِ آئنہ
خود نمائی، عیبِ خود بینی سے ہے معیوب تر
کاش خود بینا ہو روے خود مبینِ آئنہ
دیکھے کن آنکھوں سے وہ دل ہائے حیراں کو خموش
جو سنے نت توڑ کر آہِ حزینِ آئنہ
مت دکھا چہرہ تو اپنا اس کو اے خورشید رو
پھونک دے گی خلق آہِ آتشینِ آئنہ
چاشنی گر خدا بینی ہو تو ہرگز نہ پائے (کذا)
جوں مگس خود بیں بہ دامِ انگبینِ آئنہ
یوں ملی یہ مشتِ خاک اُس آبِ گوہر سے کہ جوں
طین ہے اب آئنہ اور آب طینِ آئنہ
خود نما ہے چشم میں وہ شوخ تو خود بیں یہ دل
واں ہے جلوت میں تو یاں خلوت گزینِ آئنہ
پردہ اُٹھنے پر بھی اُٹھا ہی رہے جیسا کہ ہے (کذا)
ہووے جس دل کا یقین مثلِ یقینِ آئنہ

کنزِ (مخفی) کیوں نہ سمجھیں ہم بقاؔ اپنی ہی ذات
کھل چکا ہے اپنی نظروں پر دفینِ آئنہ

نظر سے گم ہوں، ضعیفی سے میرا حال ہے یہ
جو کچھ تو دیکھے ہے پیارے، ترا خیال ہے یہ

یہ رخِ یار نہیں زلفِ پریشاں کے تلے
ہے نہاں صبحِ وطن، شامِ غریباں کے تلے

کیا[1] کریں، سینہ جو ناصح سے چھپاتے نہ پھریں
داغ سے داغ ہیں کچھ اپنے[2] گریباں کے تلے

آہ کی برق جو سینے میں چمکتی دیکھی
طفلِ اشک آہ[3] ہی چھپے دامنِ مژگاں کے تلے

دل میں آتا ہے، کروں، اے گلِ خنداں تجھ بن
بیٹھ کر گریہ، کسی نخلِ گلستاں کے تلے

یوں نہاں داغِ جگر آہ سے رکھتا ہوں کہ جوں
باد سے شمع چھپائے کوئی داماں کے تلے

شیخ، ڈرتا ہوں، کہیں بیٹھ نہ جاوے یہ کنواں
مت کھڑا ہو تو عصا رکھ کے زنخداں کے تلے

نہیں ملنے کی بقا ہم کو بجز گنجِ مراد[4]
جائے آسودگی، اِس گنبدِ گرداں کے تلے

مت چمن میں جا، گلوں کے رُخ سے رنگ اُڑ جائیں گے
روے دے نادیدہ گل سب بید رنگ اُڑ جائیں گے

چھوڑ اے گل چیں، چمن میں آشیاں کا خار و خس
آ ترے ہاتھوں سے اک دن ہم بہ تنگ، اُڑ جائیں گے

گر خوارق سے اُڑے تم، تو تمھارے ساتھ شیخ
ہم بھی چرخِ ہشتمیں تک، پی کے بنگ، اُڑ جائیں گے

---

[1] گ : کیا کروں سینہ جو ناصح سے چھپائے نہ پھروں۔

[2] گ : میرے۔ [3] ش، ک، سخ : آن چھپے۔

[4] گ : مراد۔

ہے یہی دورِ فلاخن طور، تو اہلِ وقار
سب کے سب گردش میں آکر مثلِ سنگ اُڑجائیں گے
شب تو آوے گا مری مجلس میں، تو اے رشکِ صبح
شمع ہو جاویں گی گُل، اور سب پتنگ اُڑجائیں گے
ست اکیلا سو، کہ عاشق ہیں ترے جنّ و پری
لے کسی شب خواب میں تیرا پلنگ اُڑجائیں گے
غیر نے قاصد نہ کر بھیجا ہمیں تجھ تک، کہ یہ
دست شل ہیں، لے کے خط بالائے لنگ اُڑجائیں گے
مجمعِ زہّاد ہے، پر رند کوئی سنگ سا
آپڑا ان میں، تو سب مثلِ کلنگ اُڑجائیں گے
خواب سے کھل چٹکیاں مژگاں کی اے ابرو کماں
غمزے تیرے صیدِ دل کو جوں خدنگ اُڑجائیں گے
یہ تپش ہے تو بقا بانالۂ آتش فشاں
ہم کسی شب چرخ پر مانندِ چنگ اُڑجائیں گے

سیر میں تیری ہے بلبل، بوستاں بے کار ہے
بوستاں غیرت سے خود اُجڑا، خزاں بے کار ہے
چھوڑ کر آنسو کو، لختِ دل گیا ہمراہِ آہ
ناو خشکی میں چلی، آبِ رواں بے کار ہے
گہ زمیں سے بام پر ہوں، بام سے گہ برزمیں
اِس تپش سے، اپنے گھر کی نردباں بے کار ہے

آئی اب فصلِ گل ، اور مجھ عندلیبِ زار کا
ہے نشیمن شاخِ گل پر، آشیاں بے کار ہے

یار سے اور ہم سے ، محفل میں، بچا کر چشمِ غیر
ہے سخن ایما میں باہم، اور زباں بے کار ہے

میرے ڈر سے تو نے بٹھلایا تھا در پہ پاسباں
سو میں حسرت سے موا، اب پاسباں بے کار ہے

خلق کو مارے ہے چشم اُس کی ، معطّل ہے قضا
فتنہ ہے اُس کی نگہ میں ، آسماں بے کار ہے

مانگتا ہوں بوسہ میں جس دم ، تو اُس دم یار کے
کار میں لب پر نہیں ہے، دل میں ہاں بے کار ہے

کار فرما دیکھ کر غیروں پہ ، میں اُس سے کہا
کار ہے مجھ سے بھی کچھ ؟ بولا کہ ہاں، بے کار ہے

اے بقاؔ کارواں، اس ریختے کی ہر ردیف
گرچہ ہے بے کار ، پر بتلا، کہاں بے کار ہے

ہم ناتواں دبیں[1] جو سرِ انگشت کے تلے
جاویں بہ رنگِ مورِ مر، انگشت کے تلے

آہستہ اے طبیبِ صبا دیکھ نبضِ گل[2]
بلبل کا دل ہے تیری ہر انگشت کے تلے

کیوں ہم جلوں کی راکھ دباتے ہو ہاتھ سے
آجائے گا کوئی شرر انگشت کے تلے

ملتا جو چشم، ہجر میں، اُٹھتا ہوں خواب سے
ٹوٹے ہیں اشک کے گہر انگشت کے تلے

---

[1] س : رہیں۔ [2] س : کو۔

کرتا ہے ہاتھ سے ہمیں صیّاد کب رہا
جب تک نہ لیوے دابِ پر انگشت کے تلے

روتا ہے کیوں طبیب، مگر آج اپنی نبض
دیتی ہے مرگ کی خبر انگشت کے تلے

وہ طفل، نام عشق کا، آہستہ شرم سے
پڑھتا ہے حرف ڈھانک کر انگشت کے تلے

پھاہا جو تو لگاوے کبھی میرے داغ پر
مرہم وہیں کرے اثر انگشت کے تلے

مطرب کا تارِ بین نہ سمجھو بقاؔ کہ یہ
ہے نغمہ زا رگِ جگر انگشت کے تلے

سپاہِ عشرت پہ فوجِ غم نے جو مل کے مرکب بہم اُٹھائے
اُدھر تو نالے کا تاشا کڑکا، اِدھر فغاں نے علم اُٹھائے

اس اشک و لختِ جگر سے ایک ہی فقط نہ مردم کو فائدہ ہے
جو دُر کے رولے عدد کسی نے، تو لعل کے بھی رقم اُٹھائے

سبب رقیبوں کے، بزم میں اب، گئی وہ آپس کی ہم نشینی
ہم آن بیٹھے تو اُٹھ گیا وہ، وہ آن بیٹھا تو ہم اُٹھ آئے

تہی کف آئے تھے ہم عدم سے، چلے بھی[۱] یاں سے تو دست خالی
نہ توشہ[۲] واں سے لیا تھا[۳] زر کا، نہ ساتھ یاں سے درم اُٹھائے

بقاؔ جو راہی ہوئے عدم کے، تو وقفہ ہرگز کرو نہ دم کا
یہ راہ ہستی کی پُرخطر ہے، چلو یہاں سے قدم اُٹھائے

---

[۱] گ : چلے یہاں سے
[۳] گ : یہاں تھا آیا
[۲] س : نہ توشہ واں سے یہاں تھا آیا۔

اس چہرے کی جب طرحِ رقم ہاتھ سے رکھ دی
کانوں پہ مصور نے قلم ہاتھ سے رکھ دی

کل شیخ پہ تیغ اُس نے تو کھینچی تھی، ولیکن
سمجھا کہ یہ ہے سیدِ حرم ہاتھ سے رکھ دی

لا آگہ مرے مے، مری توبہ شکنی کو
ساقی نے دلا اپنی قسم ہاتھ سے رکھ دی

نذر اُس نے بقاؔ پہلے مرے دل کی اُٹھالی
پرلے کے کیا پھر یہ ستم، ہاتھ سے رکھ دی

مجھے تو عشق میں اب عیش و غم برابر ہے
بہ رنگِ سایہ، وجود و عدم برابر ہے

نہ کچھ ہے عیش سے بالیدگی، نہ غم سے گداز
ہمارے کام میں سب نوش و سم برابر ہے

چلا ہے قافلہ، پر ہم سے ناتوانوں کو
ہزار گام سے اب اک قدم برابر ہے

بہ چشمِ مردمِ روشن ضمیر، گر پوچھو
تو قدرِ جامِ مے و جامِ جم برابر ہے

خزاں کے روز جو دیکھا تو عندلیبوں کو
صفیرِ بوم سے اب زیر و بم برابر ہے

بہت شگفتہ ہیں گلشن میں گرچہ لالہ و گل
تمھارے چہرے سے پر کوئی کم برابر ہے

یہ رندے گئے لقمہ تجھے تو عذر نہ مان (؟)
ترا تو شیخ تنور و شکم برابر ہے

وہ مستِ ناز و ادا، جس کو روز وعدے کے
شکستِ جام و شکستِ قسم برابر ہے

بقاؔ جو بار نہ دے ہم کو اپنی محفل میں
تو مرگ و زندگی اپنی بہم برابر ہے

جلوہ، تک باغ میں، قمری! جو وہ شمشاد کرے
مول لے کر ترے اِس سرو کو آزاد کرے

بیخ و بنیادِ جنوں تھی قدمِ مجنوں تک
کون اب خانۂ زنجیر کو آباد کرے

لہ مج : جامِ گل۔

یہی کاہش ہے جو غم سے تو پس از مرگ وہ شوخ
خاک بھی میری نہ پائے گا کہ برباد کرے

درسِ الفت میں ہے اُس زلف کا ہم سے یہ سلوک
طفلِ مکتب سے جو کچھ سیلیِ اُستاد کرے

رشدِ باطن کی طلب ہے تو کر اے شیخ وہ کام
پیرِ مے خانہ جو ظاہر میں کچھ ارشاد کرے

غیر بے رحم یہ کچھ، یار سو وہ پنبہ بہ گوش
آگے اب کس کے بقاؔ نالہ و فریاد کرے

خواب میں جب نظر آیا رخِ دلدار مجھے
طابعِ بد نے کیا رشک سے بیدار مجھے

کھول کر چشم جو دیکھا تو تہی ہے آغوش
وہیں حیرت نے کیا صورتِ دیوار مجھے

کیا کرے بخت جو اپنے ہیں نہ موئے اندام (کذا)
ہو کے سب دشمنِ جاں دیتے ہیں آزار مجھے

پہنچوں اس چشمِ تلک پر یہی جو کبھی (کذا)
زیرِ شمشیر ملے ابروے خمدار مجھے

چشمِ ساغر کی طرح یا لبِ ساقی میں
روز و شب اب تو ہے گریے سے سروکار مجھے

ہوں میں اُس چشم کے ہاتھوں سے بقاؔ سرمہ بکام
رہے کس طرح بھلا طاقتِ گفتار مجھے

انگشتریِ چشم ہے کس کام کے لیے
ہر لختِ دل نگیں ہو مگر کام کے لیے

دیکھا تو زیرِ قصرِ فلک دارِ خلق میں
ہرگز مکاں نہیں کوئی آرام کے لیے

اے عندلیب! باغ میں صیادِ دہر کو
منظور پرورش ہے تری دام کے لیے

پھر دور دور، مت ہو گنہ گارِ عشقِ گل
فرصت نہیں ہے دیدِ دلِ آرام کے لیے

سوداؔ کی طرح حیف بقاؔ آ جہان میں
کیا کر چلے اور آئے تھے کس کام کے لیے

عشق میں بو ہے کبریائی کی
عاشقی جس نے کی، خدائی کی

ہمسری مت صبا سے کر اے آہ
تو نے بھی کچھ گرہ کشائی کی

لے چلے ہم قفس سے اے صیّاد
خاک میں آرزو رہائی کی

روزِ محشر تلک نہ آخر ہوں
داستانیں شبِ جدائی کی

شیخ جیو سے ہوئی نہ سرزد باو
چول بولی ہے چار پائی کی

جس میں یارانِ بزم ہوں محظوظ
یوں بقا میں غزل سرائی کی

میرؔ بھی ورنہ خوب کہتے ہیں
کاٹیے جیب اُن کی دائی کی

مری چشم میں کیوں نہ خوناب اُترے
کہ دریا میں البتّہ سرخاب اترے[1]

نہ تجھ کو کرے سرو آزاد قمری
نہ گردن سے یہ طوقِ سنجاب اترے

بتاں، چشم سے دل میں، ہمراہ لے کر
جگر خون کرنے کا اسباب، اترے

کوئی موج بھی تا بہ گردن نہ گزری
یہ دریا کئی بار پایاب اترے

شعاعِ رخ اُس کی چڑھی یوں فلک پر
کہ جوں خاک پر نورِ مہتاب اترے

بقا اور اک جام ساقی سے لے لو[2]
کہ سر سے خمارِ مے ناب اترے

کل مے کدے کی جانب آہنگِ محتسب ہے
در پیش مے کشوں کو پھر جنگِ محتسب ہے

---

[1] شع : کہ البتہ دریا میں
[2] شع : لے تو

ہوتا ہے شیشۂ دل چور اُس کی گفتگو سے

یارب! یہ پندِ ناصح یا سنگِ محتسب ہے
منہ سرخ ہو رہا ہے بیمِ معنال سے اُس کا
جو کچھ ہے رنگِ مینا، سو رنگِ محتسب ہے
از بس گراں ہے اُس پر مینائے مے کی قلقل
پڑھنا بھی چار قُل کا اب ننگِ محتسب ہے
ہرگز بقا نہ رہیو دورِ فلک سے غافل
مستوں کی نت کمیں میں سرچنگِ محتسب ہے

جاؤں گا چمن میں دلِ نالاں کو بہم لے
واں نالۂ بلبل کا ٹک اک راگ تو جم لے

تسخیر کو جاتی ہیں جدھر اشک کی فوجیں
نکلی ہے اُدھر آہ بھی کاندھے پہ علم لے

ہے گریۂ بلبل پہ ترحم اُسے، ورنہ
چاہے تو ابھی گل سے وہ ہنسنے کی قسم لے

بس پائے جنوں، سیرِ بیاباں تو بہت کی
اب خانۂ زنجیر میں ٹک بیٹھ کے دم لے

افسوس کہ ہم رشک سے ہوں خاک برابر
اور بوسہ کفِ پا کا ترے نقشِ قدم لے

یہ ریختہ جس دن سے بن آیا ہے بقا خوب
یاروں نے تو کیا کیا نہ کیے تیرے حملے (کذا)

الفاظ و معانی میں رہے رخنہ فگن یوں
جس طرح کہ گلبرگ کے تئیں .....

ترے مریضِ محبت کی نبض چھوٹ گئی
ٹک اک جو آس تھی جینے کی، آج ٹوٹ گئی

رہے اسیرِ قفس اب کے سال بھی محروم
خزاں کی فوج، چمن کی بہار لوٹ گئی

تغیرِ حال مرا دیکھ کر، گجر بجتے شبِ فراق بھی چھاتی کو اپنی کوٹ گئی

بقاؔ، یہ گریہ نہاں کب تلک رقیبوں سے
ستم ہے حق میں ترے گریہ بات پھوٹ گئی

مرا دل اب تو جوں شبنم بندھا ہے گل کے پتّے سے
ڈرا مت مجھ کو اے بلبل تو اتنا اپنے کتّے سے

کیا ہے خوں مرے دل کو حنا کی سادہ کاری نے
پنھائے پور پور آخر مرے ہاتھوں میں چھلّے سے

شکستِ دل پہ رندوں کی، عبث تو شیخ مرتا ہے
کوئی یہ قلعۂ روئیں ترے ٹوٹیں گے ہلّے سے

نہ بچنے دے کوئی دانہ، نکالے چیر کر پہلو
بھرے بھی آسیا کا منہ کبھی گردوں جو غلّے سے

بقاؔ خاموش رہتا ہے، جو کھینچے ایک بھی نالہ
تو ننگے پانو ہمسایے نکل بھاگیں محلّے سے

رنگ میں ہم مس سے بتر ہو چکے لیک اُسی مس سے کہ زر ہو چکے
رخ کو ترے شب سے میں تشبیہ دوں پر اُسی شب سے کہ سحر ہو چکے
چہرہ ترا ہے مہِ نو اے صنم پر وہ مہِ نو کہ قمر ہو چکے
رشکِ گلِ سیب ہے تیرا زنخ لیک وہی گل کہ ثمر ہو چکے

قطرۂ نیساں ہیں وہ دنداں بقاؔ
پر وہی قطرہ کہ گہر ہو چکے

دل سے وہ نگاہ پیر گزری　　پر شکر کہ جی کی خیر گزری
کیا فصلِ بہار کیا خزاں میں　　اِس باغ کی کرتے سیر گزری
محفل میں بتا تو کس طرح سے　　اغیار سے ہم بغیر گزری
جیتی ہوئی ہم سے مہر سرزد　　اُتنی تمھیں کرتے بیر گزری
جانا ہی بقا بھلا تھا دل کا
کچھ تیری اِسی میں خیر گزری

ہاں میاں سچ ہے، تمھاری تو بلا ہی جانے
جو گزرتی ہے مرے دل پہ، خدا ہی جانے
دل سے نکلے کہیں پا بوسیِ قاتل کی ہوس
کاش وہ خوں کو مرے رنگِ حنا[1] ہی جانے
دل کی واشد پہ عبث آہ نے کھینچی تکلیف
کھولنے عُقدے تو غنچوں کے صبا ہی جانے
روز و شب نزع میں ہے عاشقِ چشم و لبِ یار
نہ تو جینا ہی وہ سمجھے، نہ فنا ہی جانے
ہم تو نت دُور سے خمیازہ کشِ حسرت ہیں
لذّتِ بوس و کنار اُس کی حیا ہی جانے
تیرے بیمار کو کیا[2] ہوئے شفا، جس کے طبیب
نہ تو کچھ درد کو سمجھے[3]، نہ دوا ہی جانے

---

[1] ش، ک : حنائی　　[2] س : کب ہووے　　[3] گ، س : پہنچے

پوچھ اِس دل سے جو ہے کاٹ ترے ابرو کا
جوہرِ بُرّشِ شمشیر سپاہی جانے

اپنی[1] مرضی تو یہ ہے بندۂ بت ہو رہیے
آگے مرضی (ہے) خدا کی، سو خدا ہی جانے

طور پر اپنے سخن کون بُرا کہتا ہے
پر یہ انداز جو پوچھو تو بقاؔ ہی جانے

اب کہاں تاب، جو نالے میں کروں شوروں سے
سانس بھی آتی ہے لب پر تو بڑے زوروں سے

دیکھ احوال تو ٹک اپنے تو بیماروں کا
مُردے گویا کہ اُٹھ آئے ہیں ابھی گوروں سے

ہے ضعیفوں کا پے بوسہ ترے لب پہ ہجوم (؟)
حق تعالیٰ ہی بچاوے یہ شکر موروں سے

شکّرِ بوسۂ لب ہم کو نہ دے کیا طاقت
تاب ہے گل کی جو منہ موڑے شکرخوروں سے (؟)

جب ہوس ہوتی ہے فندق کی تو ملتے ہیں بتاں
مثلِ عنّاب مرے لختِ جگر پوروں سے

ہند خط چڑھ گئے سب اُس کے فرنگِ رخ پر
فوج کالوں کی جُٹی آن کے اب گوروں سے

---

[1] ج۔

دل دوں کس طرح بقاؔ ہاتھ میں اُس غافل کے
کف میں جو رنگِ حنا رکھ نہ سکے چوروں سے

آ کے ناصح جو مرا لبسِ دریدہ کاڑھے
تو سوئی لے کے وہ بھڑوا بھی کشیدہ کاڑھے

تو نہاتا ہے جو دریا میں، تو آنکھوں کو تری
بیٹھے تکتے ہیں صدف آب سے دیدہ کاڑھے

تجھ سے خوبی میں ہوں ہمسر، تو مہ و مہر کو کیوں
گوش و بینی نہ فلک کر کے بریدہ کاڑھے

گل ہو پژمردہ تجھے دیکھ کے، تو تیرے لیے
پھر کہاں سے وہ بھلا رنگِ پریدہ کاڑھے

دل نکالوں گا ذقن سے تری یوں باقدِ خم
چاہ سے دلو کو جوں کوئی خمیدہ کاڑھے

مجھ کو شانے سے خطر ہے کہ پکڑ زلفوں سے
دل کو میرے نہ یہ اب دست بریدہ کاڑھے

دیکھوں اُس مہر کو گلشن میں تو عطسہ دو ہیں
گل کی آسر سے مرے بوے شمیدہ کاڑھے

پھر مشیخت کی بھلا کیونکے لگاوے ٹگی
شیخ گر ریش سے اپنی نہ رفیدہ کاڑھے

یادِ لب میں ترے یوں ہونٹوں پہ لاتا ہوں میں جھاگ
منہ سے کف جیسے کوئی مار گزیدہ کاڑھے

صیتِ اشعار تری خلق سے تب کم ہو بقاؔ
جب کہ گوشوں سے کوئی حرفِ شنیدہ کاڑھے

کہتا ہے دم بوسہ، چل دور کہاں کا ہے
لے ہم سے، ترا ایسا مقدور کہاں کا ہے

دکھ درد جو پھر کوئی تم حضرتِ دل لائے
یہ حصۂ بخت اپنا بھرپور کہاں کا ہے

ہنستا ہے جو تو اپنے کمزور ضعیفوں پر
انبار میں تو ایسا شہ زور کہاں کا ہے (کذا)

ہیں دوست مرے لاکھوں، پر ہائے نہ ناصح سے
یہ دوست خدا جانے آخور کہاں کا ہے

سن غیب سے پردے سے آہ اُس کے ضعیفوں کی
حضّار کو ہے حیرت یہ شور کہاں کا ہے

جب بام پہ تو جاوے تو خلق میں غوغا ہو
خورشید چھپا ہے گا، یہ نور کہاں کا ہے

اُس خور کے جلوں کا جو کافور کفن ہووے
یہ ماہِ خنک پرتو کافور کہاں کا ہے

دل نیم نگہ پر لے، جاں مانگے ہے دستوری
دستوریِ جاں ظالم دستور کہاں کا ہے

حیراں ہے مسیحا بھی کچھ روگ میں اس دل کے
کیا جانیے یہ روگی رنجور کہاں کا ہے

بادے میں ترے ساقی، ہے زخمِ جگر کی بو
یہ جس سے چُوا ہے وہ انگور کہاں کا ہے

اس دل پہ کہ ہر ساعت اک تازہ تجلّی ہے
کیا جانے اسے موسیٰ، یہ طور کہاں کا ہے

جب ذکر مرا چھیڑے کوئی، تو وہ کہتا ہے
جانے دو یہ اے صاحب مذکور کہاں کا ہے

فریادِ جگر تیری ہے سخت بقا دل کش
یہ زیرِ بغل تیرے طنبور کہاں کا ہے

تربت میں میری آہ سے یہ زلزلے ہوئے
طبقے زمیں کے جس سے کہ اوپر تلے ہوئے

ساقی، تغافلوں سے ترے، موسمِ بہار
سینے ہیں مثلِ تاک ہمارے چھلے ہوئے

جو دل لیے تھے زلف نے منہ مانگی شرط پر
سو دل پڑے ہیں پانو کے نیچے ملے ہوئے

بس آہِ آتشیں کہ اب اُس در پہ دادخواہ
لے کر چلے ہیں نعش پہ مردے جلے ہوئے (کذا)

.....
پھیرے ہے راہ سے مری قاصد چلے ہوئے

بیٹھا ہے اب تو ہو کے یہ اڑیل، نہ جائے گا
چھاتی پہ میری مونگ یہ غم بن دلے ہوئے

رویا تھا بس کہ یہ دل آنکھوں سے شمع وار
آنسو جو کچھ بہے تھے سو جم کر ڈلے ہوئے

تھے اور کی ہوس میں تو عاشق ہی سب برے
اب تیری رہ روی میں تو عاشق بھلے ہوئے

میرے ترے جو رشک سے شب بزمِ مے میں یار (ق)
تھے دلبران و دلشدگاں سب جلے ہوئے
شمعیں عرق ہو شرم سے ہوتی تھیں سیلِ مے
پروانے سب کباب تھے گھر کے تلے ہوئے

ہنس کر گئے تھے کوچۂ قاتل میں ہم بقا (کذا)
آئے نہ خاک و خوں میں وہاں سے رلے ہوئے

جس[1] کو کہتے ہیں یہ رہ رو جرسِ محمل ہے
محنتِ راہ سے نالاں وہ[2] ہمارا دل ہے

موج سے بیش نہیں ہستیِ وہمی کی نمود
صفحۂ دہر پہ گویا یہ خطِ باطل ہے

کچھ تعیّن[3] نہیں اس راہ میں جوں ریگِ رواں
جس جگہ بیٹھ گئے، اپنی[4] وہی منزل ہے

آستیں حشر کے دن خوں[5] سے بھری ہو جس کی
یہ یقیں جانیو اُس کو کہ مرا قاتل ہے

کھول دو عقدۂ کونین بقا کے پل میں
یا علی تم کو یہ آساں[6]، اُسے مشکل ہے

جدا کرنا ہو سر میرا جو ہر تقدیر گردن سے
تو یوں مل مل کے پھر جاوے نہ وہ شمشیر گردن سے

جدا سر ہو گیا تن سے تو شمع آسا خموشی میں
کریں گے سوزِ دل اپنے کی ہم تقریر گردن سے

جو دیکھیں خواب میں شب کو تری شمشیر اے قاتل
تو پوچھیں صبح ہم دیوانگاں تعبیر گردن سے

مسخّر طرۂ شمشاد کی ایسی ہے گر قمری
تو اُترے گا نہ اس کی حلقۂ تسخیر گردن سے

قلم کا سر قلم کرتا ہوں میں اب قط کے پردے میں
کرے تو اک غزل ایسی یہ پھر تحریر گردن سے

نہ گزرا تھا ہنوز اُس کی دمِ شمشیر گردن سے
کہ ہاتھ اے یار دھو بیٹھا ترا نخچیر گردن سے

---

[1] ہ، گ، د، ج: رہ رواں کہتے ہیں جس کو۔ س: جس کو کہتے ہیں مسافر۔

[2] ج: یہ۔

[3] گ: تعلق۔ ج: تیقّن۔

[4] س: آہ وہی۔

[5] ہ، گ، د، ج: خون سے تر ہو جس کی۔

[6] ہ، ج: یہ آساں ہے۔ ج: تم کو ہے آسان۔

سپید اے کوہکن یاں تک ہوا تھا خون خسرو کا
کہ بہتی اُس کے وقتِ ذبح جوئے شیر گردن سے

یہ لیلیٰ وش مگر مجنوں ہیں اپنے ورنہ کس خاطر
رکھیں پیوستہ کاکل کی سدا زنجیر گردن سے

گھُلا ہوں شمع ساں، دامن مرا مت کھینچ اے ناصح
گریباں سرکو لے اُترے گا جوں گلگیر گردن سے

جو کرتا اس مسی آلودہ لب سے نیلوفر دعویٰ
گزرتی اس کی موجِ آب جوں شمشیر گردن سے

کٹا جوں خامہ سر، تو کیا ہے، نامہ اپنے قاتل کو
کریں گے شکلِ بے سر خامہ، ہم تحریر گردن سے

نہیں رعشہ سرِ زاہد میں، ہر دم مرگ کو اپنی
اشاروں میں بلاتا ہے یہ مردِ پیر گردن سے

قسم معصومِ دشتِ کربلا کی، یہ وہ دورہ ہے
بقا گر مانگیے پانی، تو گزرے تیر گردن سے

جو تم اور صبح اور گلنار خنداں ہو کے مل بیٹھے
تو ہم بھی اُن میں باچاکِ گریباں ہو کے مل بیٹھے

نہیں کھُلتے جو لوں اُس شہد لب سے بوسۂ ثانی
یہ لب یوں بوسۂ اوّل میں چسپاں ہو کے مل بیٹھے

اُڑا دوں دھجیاں دل کی اگر ان میں سے کوئی بھی
قبائے سرخ میں تیری گریباں ہو کے مل بیٹھے

یہ جزوِ ہمدگر ہیں اے کماں ابرو، عجب مت کر
جو دل تیرے سرِ ناوک پہ پیکاں ہو کے مل بیٹھے

ابھی دل جمع ہے، اے شانہ کر جلدی سراغ اس کا
مبادا اُس زلفِ مشکیں میں پریشاں ہو کے مل بیٹھے

سنا اے طفل جب مژدہ تری مکتب نشینی کا
یہ اجزائے دلِ سیپارہ قرآں ہو کے مل بیٹھے

ہمارا رشک سے دل جل کے خاکستر ہوا، یا قسمت
اور ان دامن میں مستی زیبِ دنداں ہو کے مل بیٹھے
یہ وہ مجمع نہیں ناصح جہاں ہو دخل دانا کو
مگر تجھ سا کوئی مکّار، ناداں ہو کے مل بیٹھے
یہ انساں زاپری وش ایسے دل کش ہیں کہ بے وحشت
پری آوے اگر ان میں، تو انساں ہو کے مل بیٹھے
یہ اطفالِ حسیں عاشق کا جی لینے میں شیطاں ہیں
جسے عاشق وہی ان میں جو شیطاں ہو کے مل بیٹھے
بقاؔ ہم گبرِ نامسلم تھے پر آخر بہ ناچاری
وہ مسلم زادہ طفلوں میں مسلماں ہو کے مل بیٹھے

تھے ہم استادہ ترے در پہ، ولے بیٹھ گئے — تو نے چاہا تھا کہ ٹالے، نہ ٹلے، بیٹھ گئے
بزم میں شیخ جی اب ہے کہ ہے یاں، عیب نہیں (کذا) — فرش پر گر نہ ملی جا، تو تلے بیٹھ گئے
غیر بدوضع ہیں، محفل سے شتاب اُن کی اُٹھو — پاس ایسوں کے تم اے جان بھلے بیٹھ گئے
گھر سے نکلا نہ تو، اور منتظروں نے تیرے — در پہ نالے کیے یاں[1] تک کہ گلے بیٹھ گئے
ناتواں ہم ہوئے یاں تک[2] کہ تری محفل تک — گھر سے[3] آتے ہوئے، سو بار، چلے، بیٹھ گئے
اشک اور آہ کی شدّت نہ تھمی[4]، گرچہ بقاؔ
گھر کے گھر اس میں ہزاروں کے جلے، بیٹھ گئے

---

[1] س : اتنے۔ [2] گ، ج، س، ج : اتنے۔
[3] گ : ڈرسے۔ ج، س : درسے۔ [4] ج، س : نہ مٹی۔

ترے جو خالِ سیہ لب پہ آشکارا ہے
کسی کے بختِ سیہ کا مگر ستارا ہے

چمن میں لالہ نہیں، تجھ کو دیکھ کر قاتل
زمیں سے خونِ شہیداں نے جوش مارا ہے

وہ زلف بارِ دلِ مضطرب اُٹھا نہ سکے
یہ قطرہ خوں جسے دل کہتے ہیں گے پارا ہے

ہوائے عیش نہیں، جب سے ہجر میں تیرے
الم کو قول دیا، غم سے ہاتھ مارا ہے

نہیں دیا ہے جواب اضطراب نے اس کو
کبھی جو صبر درِ دل پہ آپکارا ہے

بقاؔ کی آہ نے اُس میں کبھی نہ کی تاثیر
بتاں! یہ دل ہے تمھارا کہ سنگِ خارا ہے

اگر[1] مشفق و مہرباں ہے تو تو ہے
بلائے دل، آشوبِ جاں ہے تو تو ہے

فلک پر چڑھا مجھ کو اے نشّۂ مے
کہ اس بام کی نردباں ہے تو تو ہے

جدا مت ہوا اے داغ چھاتی سے میری
گئے دل کا اب اک نشاں ہے تو تو ہے

یاد[2] میں تڑپے ہے یہ کس[3] ابروئے خمدار کی
آج کچھ ناخن بہ دل ہے آہ اس بیمار کی

رُخ[4] اُس کا صفا تیرے کفِ پا کی نہ پاوے
خورشید ہزار اپنے تئیں چرخ چڑھاوے

تیر باحسرت مری جانب کمانِ یار سے
دیکھتا پیچھے کو آیا دیدۂ سوفار سے

۱؎ ج۔
۲؎ م، ع: تڑپے ہے دل۔
۳؎ ز، ش، شع: اُس۔
۴؎ ہ: رخ اُس کا صفائی ترے تلووں کی۔ د، ل، ش، ک، ن: صفائی ترے تلوے کی۔

گریے سے بعدِ مرگ یہ طغیانِ آب ہے　　گبندِ مرے مزار کا مثلِ حباب ہے

خوں جگر میں نہ رہا، گریے کے کرتے کرتے　　ہو گیا شیشہ تہی جام کے بھرتے بھرتے

آ کر[1] بہ زیرِ مژگاں یوں دل کا لخت دم لے　　جوں آن کر مسافر زیرِ درخت دم لے

سخن کی آب افزوں ہو جو اہلِ ہوش تک پہنچے
گہر ہووے وہ قطرہ جو صدف کے گوش تک پہنچے

ہم آ کر مر گئے ظالم تری دہلیز پر ڈر کے　　موئے افسوس کس جاگہ، ہوئے گھر کے نہ باہر کے

نہ گھر ملے، نہ تو باہر، نہ آستاں پہ ملے　　تو ہی بتا کہ ملے تو، تو کس مکاں پہ ملے

ملی تھی دل میں اس ناوک کی بھال... سے　　خدا جانے ہوئی کاہے سے بیدل.... سے

ماہِ[2] نو انجم کے عقدے کس طرح سے وا کرے　　ہوں جہاں لاکھوں گرہ، واں ایک ناخن کیا کرے

کیا[3] تجھ کو لکھوں خط، حرکت ہاتھ سے گم ہے　　خامہ بھی مرے ہاتھ میں انگشتِ ششم ہے

---

[1] ع: مژگانِ تر کے نیچے۔　　[2] ن۔

دیدۂ[1] تر چھٹ چواوے کون اس کے منہ میں آب
نزع کے دم گر ترا بیمار منہ کھولے رہے

گر دو[2] گے بقا کو تم آ نزع کے دم بوسہ تو اُس کے تئیں گویا تم آبِ بقا دو گے

(نوٹ) مخطوطے میں ورق ۷ الف پر سب سے پہلے ایک رباعی ہے، جس پر یہ عنوان لکھا ہوا ہے، "رباعی ہجو میر تقی"، لیکن یہ درحقیقت ۵ اشعار پر مشتمل قطعہ ہے، جس کا پہلا شعر یہ ہے:

عیب ہے گرچہ کثرتِ یک لفظ سخنِ فارسی سے تا ہندی

یہ قطعہ حصّۂ ہجویات میں شامل ہے۔ اس قطعے کے نیچے ۴ متفرق شعر لکھے ہوئے ہیں۔ پہلے شعر پر بطور عنوان "ولہ" لکھا ہوا ہے، یہی صورت دوسرے شعر کی ہے۔ البتہ اس کے بعد "ولہ میر تقی" لکھ کر دو شعر لکھے گئے ہیں۔ یہ چاروں شعر اسی طرح درج کیے جاتے ہیں۔ بقا سے ان اشعار کا انتساب محلِ نظر ہے۔ اس لیے ان کو اصل متن میں شامل نہیں کیا گیا۔ یہ اشعار جس صورت سے لکھے ہوئے ہیں، اسی طرح نقل کیے جاتے ہیں۔ تصحیح سے کام نہیں لیا گیا۔

ولہ

یہ تو نہیں کہتا ہوں کہ سچ مچ کرو انصاف جھوٹی بھی تسلّی ہو تو ضائع نہ ہوں میں

ولہ

بیکل جو بہی جاتی تو سب یہ خلل جاتا نکلا ہی نہ جی ورنہ کانٹا سا نکل جاتا

---

[1] شع [2] سخ

ولہ میر تقی

فرہاد ہاتھ تیشہ پہ پیچھے ہی ڈالتا
پتھر میں سر ہاتھ ہی اپنا نکالتا

تھا مستعار حُسن سے اس کے جو نور تھا
خورشید میں بھی اُس ہی کا ذرا طور تھا

رباعیات

و

قطعات

زاری کی نہ میری کچھ اُسے شرم ہوئی
روتے سے نہ طبع اس کی کچھ نرم ہ

ہر آہِ خنک بقاؔ خنک تھی اس پر
اب نالۂ گرم سے بہت گرم ہ

رباعی بجنیس

یا کاش کہیں لگیں ٹھکانے مرہم
یا کاش کہیں لگیں ٹھکانے مرہم

مرہم لگیں زخمِ دل پہ تا ہووے زیست
یا کاش کہیں لگیں ٹھکانے مرہم

آتا ہے یہ دل میں عشق بازی کیجے
اس دل کو کسی بت کا نمازی کیجے

چشم اُس کی بقاؔ رام نہ ہووے، تو بھی
اپنی سی غرض زمانہ سازی کیجے

اِس باغِ جہاں کے بیچ ہنگامِ بہار
جتنے تھے درخت، میوہ لائے بر و بار

امّیدِ ثمر میں ایک اپنا ہی بقاؔ
ہے دستِ تہی بلند مانندِ چنار

در مذمّتِ نفس

گو ہم پئے دیں کفر تجیں بے کم و کاست
چھوڑیں طلبِ حق میں بتاں کی درخواس

سو سال بقاؔ زیرِ زمیں رکھّیں دفن
تو بھی نہ سگِ نفس کی دُم ہووے راس

آوارۂ وادیِ طلب کو افلاک
ہر گاہ کریں جور و تعدّی سے ہلاک

پیوندِ زمیں بھی کر کے آرام نہ دیں
پھر شیشۂ ساعت میں بھریں اُس کی خاک

صیادِ ستم پیشہ و آزار رہا — کب ہم نے کہا بند سے کہ ہم کو رہا
مرنا تو مسلّم ہے، پر اس عرصے میں — ہو جائے جو سیرِ گُل میسّر، فبہا

عاشق ہوئے جب ترے، تبھی سے نہ بنی — اک ہم سے فقط نہیں، سبھی سے نہ بنی
امّیدِ کرم پہ کیا ترا کھینچیں جور — کب آگے بنی، اگر ابھی سے نہ بنی

چُبھتے ہیں جو غم کے خار پہلو پہلو — تڑپے ہے یہ بے قرار پہلو پہلو
اتنا بھی دبا نہ چل بقاؔ کو اے عشق — اے اشترِ بے مہار، پہلو پہلو

ل

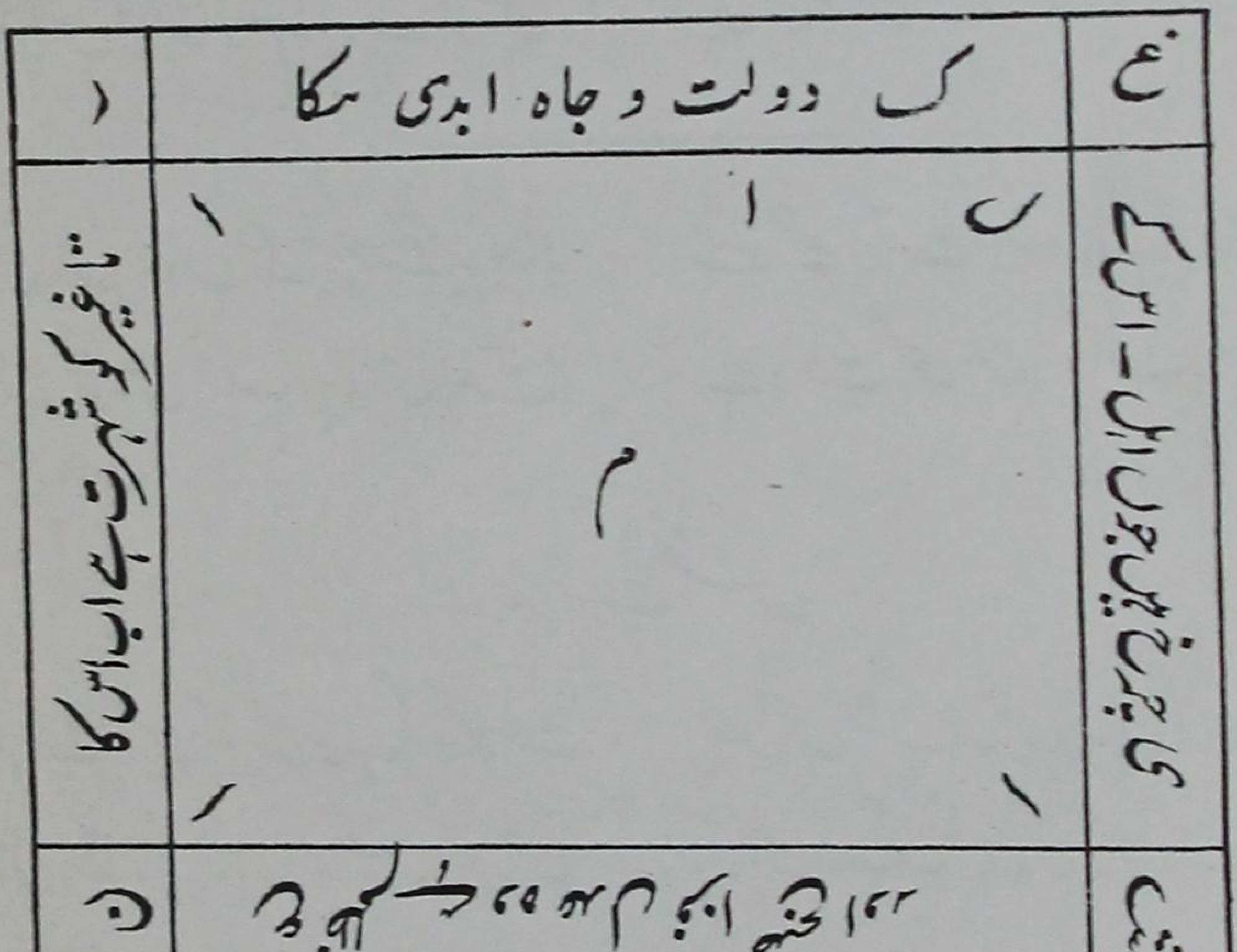

ل مالکِ دولت وجاہِ ابدی ٹیکا رام — مارتا غیر کو شہرت (سے) ہے اب اس کا نام
مانع ظلم ہے وہ عدل فزا صبح اور شام — ماشی چرخ ہیں جوں اہل (جہاں) اس کے غلام

تقی خاں	بدولت	امیر	معظم
بدولت	میان	خلائق	مکرّم
امیر	خلائق	معزّز	بدلہا
معظّم	مکرّم	بدلہا	مسلّم

واہ

۱؎ اقبال مند ہے وہ ترا یار بے وفا ۔۔۔ افواہِ عام میں جو وفا سے ہے آشنا

۔۔۔ تو اب ہوا ہے ترا اس تلک رسا ۔۔۔ اس رشکِ مہ سے کیوں نہیں ملتا تو اے بقا

۱؎ اقبال مند ہے وہ ترا یار بے وفا ۔۔۔ افواہِ عام میں جو وفا سے ہے آشنا

۔۔۔ تو اب ہوا ہے ترا اس تلک رسا ۔۔۔ اس رشکِ مہ سے کیوں نہیں ملتا تو اے بقا

۵۱

بزم میں کب ہے تقی خاں کا کوئی اب ہمسر
رسم خود اس کی ہے داد و دہشِ درہم و زر

رزم میں قتل پہ اعدا کے جو باندھے وہ کمر
رم کرے بیم سے فوج ان کے بہ احوالِ بتر

قصائد

جب مری چشم گئی نیند سے کل رات جھپک
طائرِ خفتہ مرے جاگ اُٹھے لگتے ہی پلک

خواب میں آئی نظر مجھ کو وہ غیرت دہِ حور
حور بھی دیکھ کے شاید جسے رہ جائے بھچک

عضو عضو اُس کا ہر اک خوبی و رعنائی میں
ایک سے ایک زیادہ تھا جو کی غور تنک

مانگ وہ جادۂ ظلمت کہ سکندر جس میں
جا کے یک چند رہا کور کی صورت سے بھٹک

نیچی کنگھی میں درخشاں تھی یہ کچھ وہ کافر (؟)
جیسے تحریر کوئی زر کی ہو بالائے محک

من تو کالے کا وہیں دم میں دیا سا بجھ جائے
دیکھے عارض پہ جو اس طرۂ مشکیں کی لٹک

عام تھا دورِ قدو زلف میں اس کے ورنہ
شاخِ شمشاد پہ کوپل نہیں پھوٹی اب تک

جا چھپا زیرِ زمیں عہد میں اُس کاکل کے
چھوڑ کالے کا بن خوف سے راجا باس

خطِ ریحاں سے بنا جیوں کوئی جوتورا
ڈھیلے پیچوں نے دیا یاں وہی گردن کو مروڑ

لاف جب حسن سے مارے، تو کہے یوں وہ حسیں
ہوں تو میں ماہِ زمیں، لیک بہ از ماہِ فلک

اُس جبینِ عرق افشاں سے تھی ابرو کی یہ دھج
رہنہ برستے میں ہو جس طرح نمودار دھنک

کھل گئے پھر تو یکایک مری چھاتی کے کواڑ
لگی دینے جو وہ مژگاں درِ دل پر دستک

بے گنہ قتل پہ مردم کے کرے تھی سرگرم
چشم، اُس غمزۂ خوں خوار کو دے کر پرچک

کیا کروں چشم کی تعریف کہ وہ دونوں ترک
بھڑ گئے تو سنِ شوخی کی بہم باگ اچک

اُس کے ابرو سے تو تھی ہاتھ میں اِس کے شمشیر
اِس کے ابرو سے رہی ہاتھ میں اُس کے برچھک

تیغ پہلے جھکی جس کی طرفِ ثانی پر
کھا کے مژگاں کی تھپیڑ اُٹھ گئی الٹی ہی جھٹک

مصحف اس روے کتابی سے کرے گر دعوا
دیکھ کر صورتِ بینی کو رہے جی میں بھچک

حسن نے اس لیے بینی سے اٹھایا بیڑا
کہ میں آفاق سے دل لے کے نہ چھوڑوں جی تک

تھا شکنجے میں تپاں حسن کے دل عاشق کا
دونوں عارض میں جو دیکھے کوئی نتھنوں کی پھڑک

منخزین اُس کے وہ دو چشم کہ افراطِ حیا
پُشتِ پا سے نہ اٹھانے دے کبھی اُن کی پلک

بسکہ رکھتے تھے وہ باہم نظرِ شیشہ گداز
ساتھ شیشوں کے نہ دیکھی میں انھوں کی عینک

دونوں لب اُس کے تھے خجلت دہِ یاقوت و عقیق
سلکِ گوہر تھے وہ دندان و دہن جیوں درجک

مسیِ لب سے دہن پہ یہ تبسّم کی بہار
جس طرح غنچۂ سوسن کھلے اندک اندک

سرنگوں چاہِ زنخداں کو جو اُس کے دیکھا (ق)
بعدِ صد غور یہ سمجھا میں کہ بے شبہہ و شک

پڑ کے مرآتِ زنخداں میں کسی چاہ کا عکس
محوِ حیرت ہو، گیا راہ نکلنے کی بھٹک

گوش یوں زلف میں لگتے تھے، صدف کو جس طرح
لبِ دریا سے لگا دیتی ہو لہروں کی جھٹک

یوں چمکتا تھا پڑا اُس کے بنا گوش کا دُر
اخترِ صبح جسے دیکھ کے رہ جائے بھچک

پنجۂ مہر نہ ہو سرخ شفق سے سرِ شام
سرخی دریوزہ نہ دے وہ کفِ رنگیں جب تک

رنگِ پاں یوں تھا نمودار گلے سے اُس کے
مے کی معلوم ہو جوں گردنِ مینا سے ڈلک

کیا کروں اس کی میں اب نازکیِ دل کا بیاں
پات کھڑکے تھا تو وہ خوف سے جاتی تھی جھجک

جسم کو سِلن الملک پہ مارا ہے دوال
مت سمجھ اس کے دوپستاں میں توچھاتی ــــ

جب نظر اُس کے دوپستاں سے کمر تک پہنچی (ق)
اُس کی انگیا کو یہ سمجھا میں کہ بے شبہہ و شک

ٹوپیاں آنکھ پہ دے دی ہیں، وگرنہ یہ کمر
کرتی صیدِ دلِ عشّاق پہ چیتے کی لپک

سینۂ و پشت و پہلو میں یہ تھی شفّافی
جاوے آنکھوں میں، جنھیں دیکھ کے، بجلی سی چمک

کینِ دل پر مگر اس حسنِ جہاں سوز سے تھا
چار آئینہ سجے کام کا سالارِ یزک (؟)

ناف ایسی تھی کہ جوں چھپ کے کوئی غیرتِ حور
کھول پردے کو ذرا سا رہے ایک آنکھ سے تک

آگے کچھ بات ہے پردے کی جو چاہوں تو کہوں
پر حیا مجھ سے یہ کہتی ہے کہ بیہودہ نہ بک

ران اور ساق نے اُس کاسۂ زانو کے طفیل
ایک کاسے میں بہم حُسن کی چکّھی تھی چشک

کعبتیں اُس کے دو کعبین قدم مہرِ بساط
جیت لیں جو دلِ عاشق کو بتا کر چھلک

فندقِ پا میں یہ سُرخی تھی کہ زیرِ شمشاد
جس طرح بیر بہٹّی ہے آتش سی دہک

بیخِ شمشاد کے ریشوں میں تو قمری نے کبھی
اشکِ گلرنگ سے دانے نہ پروئے یاں تک

دھج یہ دیکھا اُس کی جو دل ہونے لگا مجھ سے وداع
وقتِ رخصت میں کہا اُس کو کہ اللہ معک

پرسشِ نام جو کی میں نے تو وہ مایۂ ناز
متکلّم ہوئی یوں، مار کے مجھ پہ چشمک

نام دولت ہے مرا، میں ہوں عزیزِ ہر دل
طرب و عیش ہے یاں اہلِ دول کو مجھ تک

ہوں دلآرام میں نوّاب محبّت خاں کی
بہرہ ور جس کی سخا سے ہے کہ دہ ہر یک

یہ کہا مجھ سے مخاطب ہو کہ اے صاحبِ ہوش
شاعری مجھ کو ہے ہر نکتے سے تیرے مدرک

کر ذرا اس کی ستایش میں تو اظہارِ کمال
جب تلک ہو سکے ظاہر، تو نہ رکھ سینے میں ڈھک

مدح گستر ہو وہیں شوق سے سن میں نے یہ بات
پُر کیا گوہرِ معنی سے سخن کا درجک

دفعتہً ہو کے مخاطب بہ خیالِ ممدوح
شعر یہ دل کے سفینے سے میں لایا لب تک

تو وہ نوّاب فلک جاہ ہے، در پہ جس کے
جبہہ سا عجز سے ہے روزِ نخستیں سے فلک

تیرے کف کو کہوں کف، یا صدفِ گوہر بخش
دل کو بھی دل کہوں، یا ثانیِ دریائے سخا

تو وہ حاتم ہے زمانے کا کہ ہنگامِ سخا (ق)
لہر دل میں ترے آوے جو سخاوت کی تنک

لعلِ کوہ و دُرِ دریا، زر و سیمِ معدن
بخش اک پل میں کرے اہلِ خبر پہ دستک

یعنی اب مجھ کو دفائن سے خبر دو تحقیق
تو میں کھدوا کے کروں قفِ بزرگ کو چک

ایک درہم کا کرے تجھ سے جو شخص آ کے سوال (ق)
شہر تنگ آئے زر و سیم سے اُس پر یاں تک

کہ کہے تجھ سے وہ، بس اب جو میں مانگوں تو قسم
تو یہ فرمائے کہ کچھ اور لے، بیہودہ نہ بک

نسبتِ ماسبق اتنا ہے ترے دور میں عدل
کہ رہے اہلِ ستم، دیکھ ستم کش کو، دبک

تاب کیا ہے جو قدم گاڑ کے یک جا ٹھہرے
آ پڑے کان میں ہاتھی کے جو پشّے کی بھنک

نہیں امکان جو بکری کے تئیں کھاوے شیر
شیر بکری جو ترے عہد میں کھیلیں کودک

شرع رائج ہے ترے دور میں یاں تک کہ مدام
ڈھول طبلوں کے لگے، کھائے تھپیڑے ڈھولک

بُردباری تری لنگر دے، تو یہ مرکزِ خاک
یک بہ یک گاوِ زمیں پر گرے اِس طرح دَلک

کہ بنے فیل کا دنداں وہیں اُس کی ہر شاخ
توڑ کر سر کو نکل آوے دہن سے ہر یک

اور جو کوہان ہے، سو.... وہ بنے اشتر کی
بیٹھ کر پشت میں، آوے تلے چھاتی کے لٹک

مہ کی غربال میں، لائق ہے کہ چھانیں گِل کو
ڈالیں جس جا ترے رہنے کو بنائے کوشک

عوضِ خشت ستاروں سے جڑیں سنگِ بلور
طشتِ خورشید میں بادل سے لگاویں آہک

رفعت اِتنی اُسے دیویں کہ نظر گردوں کی (ق)
پائے دیوار سے پہنچے جو لبِ بام تلک

تارک اُس کے سے گرے خاک پہ عمّامۂ مہر
خطِ محور سے اگر باندھ نہ لے تحت حَنک

صحن میں اُس کے ہو آراستہ وہ چار چمن
کہ جسے غیرتِ فردوس کہیں زیرِ فلک

شیشہ ہر غنچے کا پُر ہو مئے گلرنگ سے واں
ساغرِ لالہ سے گرتی ہو مئے لعل چھلک

برگ، صرصر کے جھکوروں سے سبھی دیتے ہوں تال
مرغ، مردنگ بجاتے ہوں ہر اک سمت پھڑک

بلبلیں نغمے سے رکھتی ہوں سبھی شغلِ سرود
گلبنیں، موجِ صبا سے رہیں لولی سی تھرک

صبحِ نوروز، ہر اک صبح کو واں کہہ کے صبا
بیضے غنچوں کے لڑاتی رہے سرادر.....

تیرے دامن پہ اگر اُڑ کے پڑے ذرّۂ خاک
چرخ دے پنجۂ خورشید سے دامن کو جھٹک

فارسی شعر جو کہتا ہے تو، اُس کے آگے
ہے سخن اہلِ سخن کو سخنِ سعدی تک

ریختے میں جو تری طبع ہو ٹک نغمہ سرا
شعرِ سودا کے ملے کھنڈ سے دھوبی کے فلک

سیفی ہے سیف تری جانِ عدو کی خاطر
موٹھ جادو کی ہے موٹھ اُس کی بلاشبہہ و شک

چڑھ گیا چرخ بلندی پہ اُسی کے ڈر سے
ہو گئی فرشِ زمیں، بن میں رہے کوہ دبک

تو کہیں وقتِ غضب ہاتھ میں تیرے آکر
کاٹ کاڑھے نہ یہ خوں ریز سماتا بہ سمک (؟)

تیرے خیمے کی تو کیا ہو سکے مجھ سے تعریف
جس جگہ تیرے طویلے کی کھڑی ہو اسپک

بادریسہ نہ کریں شمس و قمر کو اُس میں
کہ بڑی چرخ سے ہے وہ، یہ نہایت کوچک

وصف میں اب ترے تو سن کے پڑھوں اک مطلع
سن کے صرصر جسے، خجلت زدہ ہو جائے سرسک

لیوے سبزے کی ذرا اپنے جو تو باگ اچک
جا کے بازی وہ ہوا میں کرے مثلِ سبزک

یوں چھپے اُس سے تو، جوں چاند کے حائل ہو چکور
جوں وہ تڑپے، وہیں تیری نظر آجائے جھلک

حصر پر لشکرِ اعدا کے کبھی ہو کے سوار
دے تو کاوا جو ذرا اُس کے تئیں باگ اچک

سرعت اتنی وہ کرے حلقہ زنی میں کہ غبار
اُٹھ بگولے کی نمط، آنکھ لے ہر ایک کی ڈھک

سمجھے اُس اسپ کو القصّہ یہی دیر کے بعد
آنکھ مل مل کے جو کھولے کوئی اُس میں سے پلک

اژدہا ہے یہ کوئی، مار کے حلقہ جس نے
کر برابر سرودم بیچ میں لی گھیر کٹک

ٹک نظر اور اُٹھاوے تو کہے یوں جی میں
تیغِ عریاں کی تری دیکھ کے شانے پہ چمک

گرد اب فوج کے کرتا ہے بیٹھی خورشید
دیکھیں کس کس کو جلائے، ہے یہ شعلے کی لپک

پھر کرے تیغ زنی تو، تو وہیں اک دم میں
خاک و خوں بیچ تڑپتی نظر آوے وہ کٹک

ایک حربے سے گریں گرد میں سو کاسۂ سر
جس طرح چاک سے اُترے ہے پیالے صحنک

آوے دشمن کا ترے کیوں نہ تباہی میں جہاز
ایسے گرداب میں جب آ کے پھنسے وہ مردک

شوکت و شان جو ہاتھی کی ترے، کی میں خیال
دل سے آیا مرے فی الفور یہ مطلع لب تک

اُس کے ماتھے پہ غرض، کیا کہوں میں شانِ کجک
جس طرح ابرِ سیہ میں ہو نمودار دھنک

دانت اُس کے کوئی دیکھے جو دو سوے خرطوم
قدم اگلے مِع گردن، وہ یہ سمجھے بے شک

جوشن و خود و زرہ، مونے سیہ تاب پہن
داستانوں کی دکھا ساعد و گردن پہ چمک

وقتِ کشتی کے، سکندر نے کسی زنگی کو
بھر کے کولی میں، لیا مرکزِ خاکی سے اُچک

یا خفا کنج سے ہو، شب کو کنھیّا نکلا
رادھکا نے لی ہے پیچھے سے کمر اس کی لپک

ہے وہ برحق اِسی قابل، نہیں کچھ اس میں دروغ
کہ وہاں اس کے کو دے بوسہ جو مومن ہر یک

صورۃً تو حجرِ اسود ہے وہ، اور دانت اس کے
دونوں بازو کے .... ہیں بلاشبہہ و شک

حلقہ گر کر کے، وہ خرطوم کو لے دانتوں میں
اُس کے عاجین کو سمجھیں یہ بزرگ و کوچک

زہرہ با ساعدِ سیمیں، کیے دو ہاتھ دراز
غرفۂ چرخ میں آئی ہے بجانے ڈھولک

پھر یکایک جو وہیں چشمِ تفکّر میری
پہنچی تا غارِ دہن، چھوڑ کے اُس کی مستک

دانت یوں بولے، کہ بہتی نہ سنی ہووے گی
بیستوں سے کہیں دو شیر کی جوئیں اب تک

آ کے جب باؤ میں، مستک وہ کرے اپنی بلند
اُس کے دانتوں پہ یہیں جائے گمانِ زیرک

قلزمِ نیل میں یوسف نے لگا کر غوطہ
ہاتھ پانی سے نکالے ہیں مگر کہنی تک

ہو سوار اُس پہ تو اِس اوج کو پہنچے کہ مسیح
لا ترے ہاتھ دے آئینۂ خورشیدِ فلک

جب بٹھا کر تو اُسے، قصدِ اُترنے کا کرے
عرش اور فرش میں یوں شور کریں انس و ملک

چار میں چرخ سے آ بامِ حرم پر عیسیٰ
زد باں مانگے ہے تا آوے اُتر صحن تلک

پُخت و پُز کا ترے مطبخ کی کروں کیا میں بیاں
جس میں موقوف نہ دن رات ہو دیگوں کی کھڑک

ماہ واں چاہے کہ میں قاب سپیدے کی بنوں
مہر کے جی میں کہ زردے کی میں اں ہوں صحنک

لاکھ من مائدہ واں ہو جلے
لون سا نبھر کا ..... کھانے میں نمک

دیگ شوئی کو نہ پورا ہو کنوؤں کا پانی
کاٹ کر نہر جو واں لائیں نہ دریائے اٹک

نانِ نعمت کا نہ پھر نام لیں جو ہیں خوشخوار
تیرے مطبخ سے ملے اُن کو اگر اک جلبک

تیرے مدّاح کو بھی اب یہ توقّع ہے کہ روز
زلّۂ خوان سے پایا کرے اک قابِ خشک

ہیں تو سوتا تھا، پہ یہ خواب تصوّر ہے مجھے
جس کی ہیں پرسشِ تعبیر کو آیا یاں تک

بس بقا، کر تو دعائیہ پہ اب ختمِ کلام
آمیں، سن سن کے کہیں جس کے تئیں انس و ملک

نت خوشی بزم میں تیری رہے، اور در اوپر
ہو طرب حلقہ زن، اور عیش دے آ کر دستک

تیرے ہر دوست کے، دولت رہے قدموں سے لگی
سرِ اعدا رہے سر چنگِ حوادث سے کلک

ے معنی سے کراب جامِ سخن کو سرشار — دل میں ہے، توڑیے صہبائے خموشی کا خم

یعنی اب مدحتِ نوّاب تقی خاں کیجے — بامضامینِ تر و تازہ، بہ ضمنِ اشع

چشمِ گردوں کے لیے، جس کی زمینِ در سے — گرد باد آکے اُٹھاتی ہے سر اجھک کے غ

اس کے ہاتھوں سے جو سائل کوئی ہنگامِ سخا — سیم و زر لے کے، کرے صحنِ جہاں میں ا

متحمل ـــــ اس کی سمائی کا نہ ہو — جوں خمِ خام بکس جائے سپہرِ دوّ

تیغ میں اُس کی یہ بُرّش ہے کہ ہنگامِ غضب — کمرِ چرخ پہ بیٹھے جو کرے اُس کا

اس طرح صاف نکل جائے اُسے کر کے دو نیم — برق کر جاوے ہے جس طرح کہ گنبد سے گ

عدل میں بے بدل ایسا ہے کہ ہر میکیں سے — خود ہیں آزار کش اب وہ، جو تھے مسکیں آ

عدل کا اُس کے جو صدوہ ہے کوئی دست آموز — اُڑ کے، جنگل میں وہ شہباز کو کرتا ہے ش

اُس کا شبدیز تو خشکی پہ جہاں پیما ہے — ق — سطحِ دریا پہ بھی دوڑے جو وہ صرصر

یوں قدم تیز اُٹھاوے کہ ذرا پانی میں — سُم، سوا نعل کے، تر ہونے نہ پاوے ز

فیل اُس کا یہ تناور ہے کہ بالائے زمیں — اُٹھے ہے وار صفت، بیٹھے ہے مثلِ کہ

دن کو دیکھ اُس کی سیاہی، مجھے آتا ہے عجب — رہ گئی ہو کے گرہ کیونکے زمیں پر شبِ

دور میں اُس کے یہ ہے رُعبِ شریعت غالب — نہیں ممکن کہ کرے نغمہ کشی ساز کا

مثلِ فصّاد، غرض ہاتھ سے ہر مطرب کے — رنج میں نشترِ ناخن سے ہی رہتا ہے ن

اس کے خیمے کی بزرگی کا کروں کیا میں بیاں — طول اور عرض میں تو سارے جہاں کا ہے حص

فرشِ مخمل پہ ہے استادہ بہ ایں شوکت و شان — جس طرح باغ پہ ..... ابرِ

اُس کی ہے خاصہ خوری کا ہے ـــــ خانہ — جس کے ہر خوان سے بدلا ہے فلک نے د

نانخورش کے ہے پیالوں پہ مہِ نو قرباں — خوانچوں پر ہیں نمش کے مہ و خورشید

چست کرے زیں پہ جو دشمن کو لگا تیر بہ حلق
یوں رہے روبہ فلک اُس کی نمایاں سو فار

خون ..... جس طرح کسی طائر کا
باز کرتا ہے کوئی باز اُٹھا کر منقار

نذرِ ممدوح کی خاطر بضرورت میں نے
کہہ لیے بیٹھ کے اک دم میں یہ کتنے اشعار

کر بقا شعرِ دعائیہ پہ اب ختمِ کلام
تا کرے جا کے وہ ایوانِ اجابت میں گزار

جب تلک نام سخن کا ہے جہاں میں باقی
اور شہرت ہے سخن گو کی بہر شہر و دیار

وہ رہے ساتھ احبّا کے سدا م و شاد
دلِ اعدا کو رکھے خنجرِ اندوہ فگار

کل حضرتِ بقاؔ سے کیا میں نے یہ سوال
کہیے کچھ ایسے شعر کہ ہو ویں وہ حسبِ حال

بولے جواب میں، کہ یہ منظور ہے، تو کر
آراستہ ہمارے لیے خلوتِ خیال

جز خادمانِ فکرِ سخن، اپنے پاس تک
ساقی کو بھی نہ ہووے گزرنے کی واں مجال

لیکن وہ ہو جگہ، جو درِ دل کو کھو لیے
آ جائے واں بتوں کا نظر گلشنِ جمال

ہو شاخِ گل پہ نغمہ سرا عندلیبِ عیش
پر مارے واں نہ زاغِ غم و کرگسِ ملال

گل واں کے، دل کو صید کریں عندلیب وار
گر ایک سو بنفشہ و سنبل سے دھر کے جال

زلفِ بنفشہ کھول کے شانہ کرے نسیم
گر ہر پہ روئے قطرۂ شبنم سے بال بال

یوں غنچے سر بجیب ہوں، بیٹھیں ہیں جس طرح
گردن مراقبے میں جھکا صاحبِ کمال

ہوں ادھ کھلی کلی سے گل ایسے نمود، جوں
یوسف رہا ہوں روزنِ زنداں سے سر نکال

تیغِ شعاع کھینچے جو سایے پر آفتاب
سورج مکھی ہو سامنے اُس کے پکڑ کے ڈھال

بہتی ہو اس قدر روشِ باغ کے قریب
تا گل کی آبشار ہو آئینۂ جمال

مرغانِ بوستاں سے جو رخصت بھی ہو بہار — چھوڑے چمن میں وہ گل و نسریں کو یرغمال
ایسا اگر مقام ہو تو کیا مضایقہ — پل میں سخن کے گنج سے کردوں تجھے نہال
کی میں نے عرض، قبلہ، یہ مشہور ہے مثل — راجہ کے گھر میں بھی ہے کہیں موتیوں کا کال
حاضر ہے مختصر سا مرے دل کا یہ مقام — یہ ہے زیادہ اُس سے جو کی تم نے قیل و قال
بولے یہ مسکرا کے، کہ سب مشکلیں ہیں سہل — لیکن شکستِ خاطرِ احباب ہے محال

ممدوح سن ذرا کہ کوئی دم کی فکر میں — اُس دم نہ تیری مدح ہوئی اُن سے حسبِ حال
آئینہ تو جو ہاتھ میں لے اے نکو خصال — ہرگز پڑے نہ عکس، تو اتنا ہے بے مثال
مل کر ہوئی ہے تجھ مہِ کنعاں سے پھر جواں — دنیا اگرچہ مثلِ زلیخا تھی پیر و زال
گو تیرے ساتھ گنجفۂ مکر روز و شب — ق — کھیلا کرے یہ چرخِ مشعبد ہزار سال
ہر چند اُس کفے ورقِ آفتاب ہے — پاتا ہے گاہ پر ترے ہاتھوں سے نت خلال
عادل تو اس قدر ہے کہ اب تیرے عصر میں — یکسر مزاجِ دہر نے پایا ہے اعتدال
ہے مدرسے میں جو کوئی معقول داں، سو اب — کرتے ہیں اُس سے جا کے سبھی لوگ یہ سوال
پانی پییں ہیں ایک جگہ اب تو گرگ و میش — پس کیونکے اجتماعِ نقیضین ہے محال
شرعِ نبی ہے یہ، کچھ اب دور میں ترے — نیّت خلافِ شرع کرے کوئی، کیا مجال
طنبور جب یہ چاہے کہ نغمہ کروں بلند — فی الفور کھاوے ہاتھ سے مطرب کے گوشمال
مطلع پڑھوں اب ایک ستایش میں تیغ کی — دشمن کے جی کو جس کی فصاحت بنے وبال

چمکے اگر وغا میں تری تیغ جوں ہلال
پُرزے کرے کتاں کی طرح جسمِ بدسگال

آکر غضب میں تو، کمرِ چرخ پر کبھی — مارے ذرا میان سے اُس کے تئیں نکال
سو ہے یقین مجھ کو کہ یوں اُس کو دو کرے — کاسہ اُتارے چاک سے جوں رشتۂ کلال

..... سمجھے ہے یوں کہ موت نے مارا ہے اُس پہ جال

قوت یہ تجھ میں ہے کہ کوئی گرد تنگ دو (؟) کشتی میں گر یہ چاہے کہ لے جاؤں تجھ کو ٹال

لنگر تو دیوے اُس گھڑی ایسا کہ دفعتہً گڑ جائیں پانو تیرے زمیں بیچ جوں جبال

مارے زمیں پہ یوں کہ ہوں سب چور استخواں اُچکے پھر اُس کو تو جو پکڑ کر کمر دوال

بخشے سے بس کہ لعل و گہر بے حساب تو اے حاتمِ زمانہ، ترا سن کے یہ نوال

دریوزگی کو کوہ نے دامن کیا دراز باہر صدف نے ہاتھ دیے بحر سے نکال

لگتے نہیں زمیں پہ قدم تیرے پیل کے اس طرح سے وہ پانو اُٹھاتا ہے.... چال

جس طرح غول باندھ زمیں سے ٹک اک بلند کھولیں بہم کبوترِ دشتی ہوا میں بال

بیٹھے، تو کوہ شکل ہے۔ پر اٹھ کے جس گھڑی بازی کناں خوشی میں کبھی وہ فلک مثال

خرطوم حلقہ کر کے جو دانتوں کے درمیاں لیوے، تو اُن پہ ہوئے یہ ناظر کو احتمال

گو بدر چھپ گیا ہے سراپا خسوف میں ہر دو طرف کھلا ہے بہ مقدارِ دو ہلال

مطلع لکھوں اب اک ترے مطبخ کے وصف میں جو واں کی پُخت و پز کی زیادت پہ ہووے دال

لے دوڑیں آب کش جو وہاں مشک اور پکھال خالی ہر ایک چشمہ، تہی ہو ہر ایک تال

ایسی جگہ میں چاہیے گردوں بنے تنور خورشید ہو رفیدہ، لگانے کو شیر مال

رفعت میں تیرے خیمے کی اب کیا کروں بیاں پستی سے جس کے سامنے گردوں ہے ایک مال

سرعت میں کیا بیان کروں تیرے اسپ کی آفت ہے اُس کی دوڑ، قیامت ہے اُس کی چال

ہو کر سوار جب کہ تو اُس رہ نورد پر دل بیچ لاوے سیرِ مکانی کا گر خیال

پھینک اُس کو حدِ غرب سے میدانِ شرق تک موڑے پھر اس طرف انھیں قدموں، تو وہ غزال

نقشِ سم اپنے واں سے یہاں تک اک آن میں کر دیوے رشکِ بدر، جو ہوں غیرتِ ہلال

پھر اُس کو، عزمِ سیرِ زمانی جو کر کے تو حدِ ازل سے سوے ابد اُس کو دیوے ڈال

تو ہے یقین مجھ کو کہ طے کر لے آن میں اس عرصۂ بعید کو وہ صاعقہ مثال

پلٹے جو پھر ابد سے، تو پہنچے ازل تلک　　اثنائے راہ میں سنہِ ہجری سے کر وصال
پایا بیانِ مدح و ثنا میں سخن نے طول　　لازم ہے اب دعا پہ کروں ختم یہ مقال

نت دوستوں کو تیرے رکھے چرخ شاد کام
اور دشمنوں کو تیرے کرے جلد پایمال

ہجویات

مثنوی در ہجوِ میر

اِن آنکھوں کا نت گریہ دستور تھا
دو آبہ جہاں میں یہ مشہور تھا

جو سیلابِ اشک ان سے اٹھتا تھا زور
تلاطم میں پڑتا تھا دریائے شور

بنا میں نے ایک ریختے کا محل
لکھی در پہ اُس کے یہ ضرب المثل

وہاں آن کر میر کیا لے گیا
وہی تازہ مضموں چُرا لے گیا

عقب میں، چپ و راست پانی کا زور
کہاں جائے گا یہ دو آبے کا چور

اگر دائیں بائیں طرف یہ پھرا
کیا فرض دریا میں جا کر گرا

بھلا کون سی پا سکے گا یہ گھاٹ
نظر بھی تو آتا نہیں اس کا پاٹ

ادھر منتظر ہیں نہنگِ نظر
نگہ کے اُدھر سونس گاڑے ہیں سر

بچا ان بلاؤں سے یہ ذو فنون
تو پھر مردمِ آب ماریں گے کون

نہ منہ پھیرنے کی اسے تاب ہے
نہ کچھ آگے بڑھنے کا اسباب ہے

کہ راہِ گریز اس پہ سر بستہ ہے
دو آبہ بھی آگے سے پیوستہ ہے

مگر پھیر کر منہ کرے مجھ پہ چوٹ
بنے سحر سے اژدہا لوٹ پوٹ

مجھے یاد ہیں اُس عزیمت کی قسم
کہ کہتے ہیں جن کو کلیدِ طلسم

نگاہیں ہیں دو چشم کی دو، ولیک
جہاں گھر سے باہر گئیں، یہ پھر ایک

نگاہوں کی پھر میں چلا کر کمند
پلک مارتے اس کو کرتا ہوں بند

کمندوں کے گر پھنس گیا تار میں
چنوں ہجو کے اس کو مینار میں

وہ مینار جب تک رہے برقرار
رہے میری سارق کُشی یادگار

کہ پھر کوئی مضمون نہ سرقہ کرے
نہ نیّت، پرائے سخن پر دھرے

جو گزرے ادھر سے کوئی راہ گیر — کہے آ کے نزدیکِ مینارِ میر
یہ مینارِ دزدِ بد افعال ہے — جو چوری کرے، اُس کا یہ حال ہے
بقا جب یہ قصّہ ہوا سب تمام
دھرا میں نے "مینارِ میر" اس کا نام

ہجو ایضاً

ہم نہ کہتے تھے تمھیں اے دوستاں — دوستی بندر کی ہے جی کا زیاں
کھائے اور گھر کے، جو ہو میموں سرشت — تا ابد جاوے نہ اُس کی خوے زشت
قصّۂ اژدر رہا بالائے طاق — تازہ اک اشلک ہوئی ہے اتفاق
یعنی اس نے سن کے ہجو تازہ کی — پوچ گوئی اپنی پُر آوازہ کی
میر ہے یا نطفۂ شیطاں ہے یہ — اس قدر جو درپے انساں ہے یہ
گو کہ پہلے شاعروں میں پیکھنا — کر لگا اس کو تماشا دیکھنا (کذ
گر چھڑایا چاہو اپنی اپنی گند — اس کو جلدی سے کرو شیشے میں بند
ورنہ ہے یہ فکر میں ہر ایک کی — اپنی جا، کرلے گا انگلی نیک کی
کل پڑا تھا جا یہ اک شاعر کے سر — وہ وہیں ہرکاروں نے مجھ کو دی خبر
اس کے جی کی لگ رہا تھا تاک میں — گر نہ جا دیتا میں دھونی ناک میں
میر کے جو ہمدم و ہم ذات ہیں — وہ بھی سب از عالمِ جنّات ہیں
گر کوئی ہوتا نقیب الشاعریں — یہ منادی پھیرتا میں ہر کہیں

اُٹھ کے کل میں مسجدِ جامع گیا
واں تماشا اور ہی دیکھا نیا

چاوڑی کی شہدیاں کھیلے ہیں پیر
ہے زباں زد خلق کے آئے ہیں میر

ایسے بُھتنے سے جو تم نے پھیرٹ کی
جوتیاں سلوا لو دو دو سیر کی

یاد آئی ہے مجھے اک طُرفہ نقل
جس کے سُننے سے پڑے حیرت میں عقل

آئے کل گھر میرے اک مخلص قدیم
دل غم و اندوہ سے اُن کا دو نیم

دم چڑھا، چھاتی دھڑکتی، چہرہ زرد
ہونٹھ سوکھے، چشم تر، گردے میں درد

آہ مُردم کہہ کے، اک کھائی پچھاڑ
مفت میں جی کو لگا تب میرے بھاڑ

جب ہوئی اُن کو افاقت بیش و کم
آئی کچھ اعضا میں طاقت بیش و کم

جا سے اُٹھ بیٹھے، ہوئے گرمِ سخن
سب کیے اپنے بیاں رنج و محن

کاے محبِّ صادق الاخلاصِ من
مخلصے از دوستانِ خاصِ من

کیتکی نامی، مری ہے اک کنیز
باسلیقہ، خوش ہنر، صاحب تمیز

اُس پہ اک بُھتنا ہوا دل باختہ
رات کو آنے لگا بے ساختہ

اُٹھ کے جب وہ آسیا گرداں کرے
تب وہ ملعوں آ، اُسے حیراں کرے

دن بدن جُھرنے لگی وہ ماہ چہر
میں نے پوچھا ایک دن از روے مہر

جانِ من سچ کہہ تجھے کیا درد ہے
ایسا کیا غم ہے تجھے، کیوں زرد ہے

سرگذشتِ حال جب اُس نے کہی
مجھ میں کچھ طاقت نہ سُننے کی رہی

مصلحت دی میں کہ اے نیکو سرشت
گرم کر رکھ آج اک چولھے میں خشت

آج وہ آوے، تو تو مت کیجو شرم
بیٹھنے کو دیجو اُس کے خشتِ گرم

بیٹھ جاوے گا جو وہ اُس پر کبھو
پھر تماشا دیکھیو قدرت کا تو

مصلحت میری غرض آنی تھی راست
رہ گیا جب شب سے باقی ایک پاس

بیٹھ کر چکّی لگی وہ پیسنے
آہی گھیرا اُس کو اُس ابلیس نے

مصلحت میں نے جو دے رکھّی تھی کل
ہو گیا سرزد وہی اُس سے عمل

خشت پر جا ہی وہ بیٹھا کود کے
جل گئے دونوں سرِیں مردود کے

یک بہ یک اُس جا سے وہ بھاگا اچھل
لب پہ جاری کی یہ بیتِ برمحل

واہ بی بی کیتکی، تم زور ہو
اب[1] جو ایدھر آئے گا نڈو چور ہو

تھا کمیں میں میں بھی بالائے پلنگ
جا رہا اُس کے مقابل کر شلنگ

کر کے ریلا پیل میں جاں بازیاں
کیں دھما دھم خوب مشت اندازیاں

لیکن اُس کی خوب لگتی تھیں چپات
پر مرا روئی میں گھس جاتا تھا ہات

جب وہ میرے مارتا تھا تن کے مشت
تکّے ہوتی تھی کئی جا گہ سے پشت

جی بچا کر میں نے لی راہِ گریز
وہ بھی آیا میرے پیچھے تند و تیز

آپ تک پہنچا تو ہوں میں دوڑ دھوپ
پر کھڑے ہوویں گے در پر آپ روپ

اُن سے جب یہ ماجرا میں نے سُنا
جی ہی جی میں سوچ اپنا سر دُھنا

تلخ مجھ پہ ہو گیا اُس وقت عیش
گھر کے دروازے پہ آیا کھا کے طیش

دیکھتا کیا ہوں کہ میرا استادہ ہیں
اُس کے سر چڑھنے پہ آمادہ ہیں

آپ پر پہلے پڑھا میں نے حصار
پیچھے ٹالا ان کو پتّھر مار مار

کر بقاؔ اس بات کا یاروں میں ذکر
تا کریں جلدی وہ اپنی اپنی فکر

میرؔ نے تو ترا مضمون دو آبے کا لیا
پر بقاؔ تو یہ[2] دعا کر جو دعا دینی ہو

یا خدا، میرؔ کے[3] دیدوں کو دو آبہ کر دے
اور بینی یہ بہا اُس کی کہ تر بینی ہو

ڈرتا ہوں کرگسوں کا نہ ہو میرؔ ناشتہ
دیکھو تو کس طرح سے کھلاتا ہے مچھلیاں
دہقان تھا، تو شیخ سے سیّد یہ کیوں ہوا
یکچند تا رہے ورقِ دہر پر بقا

رنڈی کا سوکھ ساکھ بنا ہے گماشت
صیدِ افگناں رہے ہے بصیدِ گذاشت
تو ام زمیں میں گر نہ ہوا تخم کاشت
کر ایسی ہجو آبِ طلا سے نگاشت

میرؔ[1] صاحب! پھر اس سے کیا بہتر
لے کے دیواں پکارتے پھریے

اس میں ہووے جو نام شاعر کا
ہر گلی کوچے "کام شاعر کا"

یکچند میر جی نے ہم کو لگا کے لہرے
ہم کو یہ تھا بھروسا شاہوں کے ہیں یہ...
آخر کو میرؔ اپنے مضموں کے دزد ٹھہرے

پھیکے کیے ہمارے جتنے تھے شعر گہرے
چوروں کے پاسباں سے ہوتے ہیں...
سنتے کہیں نہ ہوویں، شیطاں کے کان بہرے

ہجو مرزا و میرؔ

مرزا[2] و میرؔ باہم دونوں تھے نیم مُلّا
اس واسطے بقا اب، ہجوؤں کی ریسماں سے

فنِّ سخن میں یعنی ہر ایک تھا ادھو
دونوں کو باندھ باہم میں نے کیا ہے پو

عیب[3] ہے گرچہ کثرتِ یک لفظ
سخنِ فارسی سے تا ہندی

---

[1] ن۔
[2] ن: مرزا و میرؔ دونوں باہم تھے نیم ملّا۔
[3] آ، مر: میرؔ و مرزا کی شعر خوانی نے
کھول دیوان دونوں صاحب کے
کچھ نہ پایا سوائے اس کے سخن
بسکہ عالم میں دھوم ڈالی تھی
اے بقا ہم نے جب زیارت کی
ایک تو تو کہے ہے، اک ہی ہی

ہر جدا ہے تمام عالم سے — طورِ سوداؔ و وضعِ میرؔ تقی

یعنی واں لفظِ "تو" ہے پُرکنِ شعر — "ہی" سے ہے یاں کلام کی بھرتی

کھول دیوان دونوں صاحب کے — اے بقاؔ ہم نے جب زیارت کی

شعر سوداؔ و میرؔ کے دیکھے — وہ تو "تو تو" کریں ہیں، یہ "ہی ہی"

سرسرایاں چوں کنم سر ریختہ — در جگِ پر در کنم در ریختہ دُر ریختہ

رائے زر خواہ شعر ہمچو زر سنجان کجاست (کذا) — تا بگویم از زباں زر ریختہ زُر ریختہ

کی رسد شیرینیِ شعرِ مرا شعرِ عدو — من شکر افشاندم، او گر ریختہ گر ریختہ

شعرِ تلخ تلخ گویان ہست ہمچو تلخہ تلخ — مرہ بر مربیاں مر ریختہ مُر ریختہ

در سخن طلبی، سوادِ شعرِ سوداؔ را مخر — آخرش چوں می خری خر ریختہ خُر ریختہ

زانکہ آن بی سود سودا سادہ لوحِ بیسواد — برامیدِ با ..... بر ریختہ بر ریختہ

آن خفیف العقل بہرِ خفت از بس در ذو لفظ — طرح از عطفِ بیاں ار ریختہ اُر ریختہ

در روانی میکند چوں میش در ہر گام صوت — ہمچو جرمِ موزہا چسر ریختہ چُر ریختہ

شعرِ پُر مضمون ہمی خواہد پر و بالِ بقاؔ

سازد ار ہر شاعر پر ریختہ پر ریختہ

ہجوِ دہقاں

میں پوچھا ایک دہقاں سے کہ بھائی — رسوئی آج تم نے کیا پکائی

کہا ہم آج تو بھل جی جلاوا — پلی بھر تیل دُکری کا منگاوا

تنک لے اُہتے ہم بھتّی بگھاری　　تنک لے اُہتے بکنا چھونک واری
تنک لے اُہتے کانن میں چُواوا　　تنک لے اُہتے موچھن میں لگاوا
تنک لے اُہتے اُبٹن منہ کا کیتا　　تنک لے اُہتے بینی بیچ دیتا
تنک لے اُہتے دیوا گھر کا بالا　　تنک تنری میں دل بیتا کی گھالا (کذ
تنک مانجا تلتی میں پڑا ہے　　سوداکو کال کے بینی دھرا ہے (کذ

مر — بھر دیں تو کل بھتی پکّی
بگھریے او چنا کی لے اکھسی (کذا)

ایک ملکی نے کہا قاضی سے، جب ہم نہ رہے
خاضی خصباتی ہی خصبے میں ترے ڈولیں گے
کی گرفت اُس نے جو خے پر، تو لگا یوں کہنے
قوب قاطر سے تری قاف ہی اب بولیں گے

فارسی کلام

یار باجور وجفا بوده سلامت باشد — دلم از اهلِ وفا بوده سلامت باشد
بتِ خورچهره، کزو درتب وتابیم، برو — سایهٔ حفظِ خدا بوده سلامت باشد
خلق درعهدِ لبت چون نتواند مردن — با اجل عهده برآ بوده سلامت باشد
کاحم آن لب بزمین داد، کنون حاجت نیست — عیسیٰ اکنون بشما بوده سلامت باشد
گمرهی پیرِ رهم گشت، کنون حضرتِ خضر — خلق را راهنما بوده سلامت باشد
آبِ تیغت که چو آبِ خضرم جان بخش ست — برسرم مرگِ قضا بوده سلامت باشد
گوکه دجّال وشان غول خوانند، چه غم (کذا) — مهدیم پیرِ هدا بوده سلامت باشد
مابمردیم، لبت بهرِ رقیبان چون خضر — چشمهٔ آبِ بقا بوده سلامت باشد
خضر راهم بنگه گشتهٔ خود ساز، که او — در جهان تا بکجا بوده سلامت باشد

خود مکیدو نمکانید لبِ خود به بقا
مانی اکنون به بقا بوده سلامت باشد (کذا)

هر تیرِ غمزه ات زدلم برنشان رسید — تیر یکه شد خطا زدلِ من، بجان رسید
دیدم بچهره یک دوسه اشکست پیش پیش — تاغورِ چشمِ تر بکنم کاروان رسید
برذاتِ خود زخونِ دلم رزق تنگ بود — اینک غمت بخانهٔ من میهمان رسید
تا دامن از دهانِ سگِ کوی او کشم — حاجب بقصدِ جیب ازان آستان رسید
الفت نگر که آن سگِ کو بعدِ رحلتم — بو کرده کرده تا بسرِ استخوان رسید
ناورده تابِ ضبط، فغان جست چون سپند — از مجمرِ درونِ من و دردهان رسید
معلوم جای ماهِ زمین سیرِ خود کنم — دیگر اگر بود بفلک میتوان رسید
آوازِ پای او ست بقا آشنای گوش — گر بشنوم زدور، بگویم فلان رسید

تنافر از جاہل

شبی با بقا گفتم ای نامجوی — جوانِ خردمند و پاکیزہ خوی
ترا با چنین عقل و تدبیر و ہوش — چسان گفتہ، نفس آید بگوش
ہمانا کہ او گفت ، سازی قبول — نداری سرِ موز حکمش عدول
باغوای ابلیسِ نادان فریب — دلِ خویش تا کی نہی در نہیب
مشو در کفِ نفسِ جاہل اسیر — اگر ہمچنین است، پیشین بمیر
ترا اژدہا گر بود یارِ غار — ازان بہ کہ جاہل بود غمگسار

مثنوی

مرو در پیِ عیب جویانِ خام — ببر عیب پوشی ز آئینہ وام
ازان مس مبس گردد و زر بزر — کہ ہمرنگ ہرگز ندارد ضرر
چو معیوب بیند، شود عیب دار — کہ از خود بگرداندش شرمسار
دگر بلہوس را بیفتد بدست — نماید ہمان جلوہ او را کہ ہست
بروزش بود چہرۂ دلفروز — کہ بیند در و چہرۂ خویش روز
شبانگاہ گردد ازان تیرہ رو — کہ شب روی خود را نبیند درو
ز زشتی نگویی گرت زشت گفت — نکوہش ز نیکان بیاید شگفت

ندانم بقا را ز آئینہ کم
کہ روشن دل و سینہ صافست ہم

رباعی

تا دیده بود، زدست دیدن ندهم
با دیدِ تو جان زتن رمیدن ندهم
تا هست هر استخوانِ من حاملِ گوشت
من کارد باستخوان رسیدن ندهم

میخواست بقا شام وسحر از پیِ نام
کاغازِ کلام را رساند بتمام
بسیار بگفت وگفته انجام نیافت
پس کرد کلام ختم شد ختم کلام

ALLAMA IQBAL LIBRARY
98494

K UNIVERSITY LIB.
Acc No 98494
Date 12-2-73

ALLAMA
IQBAL LIBRARY
UNIVERSITY OF KASHMIR
HELP TO KEEP THIS BOOK
FRESH AND CLEAN.